

A-PDF Merger DEMO : Purch

کتاب العروج

تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ

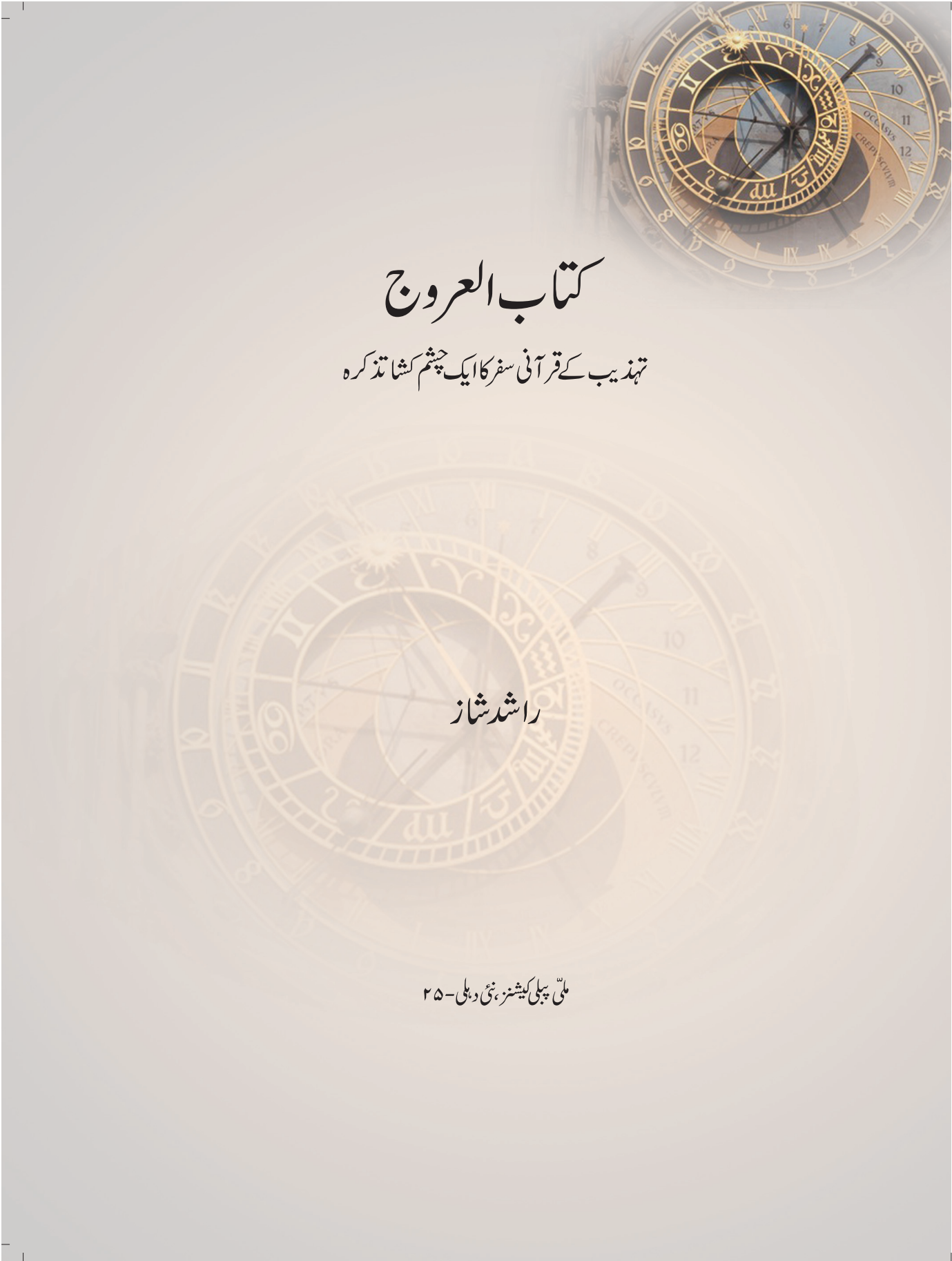
راشد شاہ

کتاب العروج

تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ







کتاب العروج

تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی - ۲۵

سال اشاعت ۲۰۱۲ء
جملہ حقوق محفوظ

ISBN 978-81-87856-28-3

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ تحقیق و تنقید اور علمی مقاصد کے علاوہ اس تصنیف کا کوئی جز کسی بھی شکل میں تجارت کی غرض سے نقل کرنا ممنوع ہے، خواہ یہ طریقہ نقل سمعی ہو یا بصری یا کسی اور سائنسی طریقہ عمل سے اسے کسی شکل میں محفوظ کیا گیا ہو، الا یہ کہ مصنف کی اجازت پیشگی حاصل کر لی گئی ہو۔

نام کتاب : کتاب العروج

مصنف : راشد شاز

اشاعت اول : ۲۰۱۲ء

قیمت : پانچ سو روپے (Rs. 500/-)

مطبع : باسکوسوائی فار پرنٹنگ، نئی دہلی، ۲۵

ڈیزائننگ : دانشا حسن

ناشر

ملی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,

Jamia Nagar, New Delhi-25

Tel.: +91-11-26945499, 26946246

Fax: +91-11-26945499

Email: millitimes@gmail.com

www.barizmedia.com

فہرست

پیش لفظ ۷

حصہ اول

الہامی تصورِ حیات کے جلو میں ۱۵

تعلیقات و حواشی ۵۰

حصہ دوم

تحریکِ اکتشاف کی ہجرت ۷۷

تعلیقات و حواشی ۱۶۵

پس نوشت

ایک نئی یونیورسٹی کا منصوبہ ۲۲۳

۱۱ ایک نئی ابتدا بالکل ہی نئے انقلابی اقدامات کی طالب ہے۔ غور و فکر کے پرانے سانچے جب تک نہیں ٹوٹتے ایک نئے شاگلے کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ آج جب ہمارے علمی التباسات اور منہجی انحرافات پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے نئے اقدامات کے لیے کم سے کم شرط ایک نئے دماغ کی تیاری ہے جو یقیناً پرانی کتابوں کے مطالعہ سے تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ نیا دماغ تشریح و تعبیر کے گھسے پٹے طریقوں کے بجائے قرآن مجید کو ایک نشانِ ہدایت کے طور پر کچھ اس طرح برتنے کا اہل ہوگا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شاہراہ وحی کی تجلیوں سے جگمگا اٹھے۔ آیات احکام کے ساتھ ساتھ آیات اکتشاف بھی اس کی توجہ کا محور ہوگا، گویا پوری کتاب ہدایت کو ایک وحدت رسالہ کے طور پر برتنے کی طرح ڈالی جائے گی اور اس طرح جعلو القرآن عضین کی موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہو سکے گا۔

پیش لفظ

زندگی امکانات کا ایک لامحدود سمندر ہے۔ اب یہ فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنی محدود زندگی کو لامحدود امکانات سے کس حد تک مزین اور مرصع کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ میں ایک امکانی بادشاہ ہوتا ہے، لیکن بادشاہ صرف وہی لوگ ہو پاتے ہیں جن پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور جن پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہو پاتی وہ بادشاہ کے ابرو و اشارے پر اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اور اس کی مصاجی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب بعض سپاہ زادوں اور غلام زادوں کو اپنے اندرون میں خوابیدہ بادشاہ کا ادراک ہوا اور وہ چشمِ زدن میں غلام سے بادشاہ بن بیٹھے۔ گویا دنیا میں بڑی سے بڑی تبدیلی خواہ وہ فرد کی سطح پر ہو یا اقوام و ملل کی سطح پر، یہ بنیادی طور پر ہمارے طرز فکر کی رہین منت ہوتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں جن لوگوں نے اقوامِ عالم پر حکومت کی ہے، انھوں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ فرد کے قلب و نظر پر کچھ اس طرح پہرہ بٹھا دیا جائے کہ وہ اپنی اصل قیمت اور قوت سے ہی نا آگاہ رہے۔ روایتی بادشاہت نے اگر خود کو شمس و قمر کے خانوادے سے بتایا یا الوہیت کا دعویٰ کیا تو چرچ نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے قلب و نظر پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کی اور یہی کام مشائخیت نے کبھی آلِ بیت کے حوالے سے اور کبھی راست مشاہدہ حق کے دعویٰ کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کی۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر قلب و نظر کی آزادی کی دعوت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ایک ایسی حریت فکری سے عبارت ہے، جسے قرآن و بیض عنہم اصرہم والاغلال النی کانت علیہم سے تعبیر کرتا ہے۔

خیال قوت کا لامحدود خزانہ ہے۔ انقلاب کا پہلا بیج اور ایجاد و اختراع کا پہلا موبوم خاکہ عالم خیال میں ہی وجود میں آتا ہے۔ خیالوں میں گم خاموش بیٹھا ایک نئی ترکیب کا متلاشی اپنی خاموشی سے جو اٹھل پھٹل پیدا کر سکتا ہے اس کا مقابلہ

نعرۂ انقلاب بلند کرنے والے بے ہنگم مظاہرین نہیں کر سکتے۔ ترکیبوں کی اختراع یا کسی نئے خیال کی تعمیر عجب نہیں کہ ایک فخر جدید کا عنوان بن جائے اور شاید اسی لیے مرؤج نظام فرد کو اس بات کی فرصت اور اجازت کم ہی دیتا ہے کہ وہ نئے خیال کی آسائش کا لطف لے سکے۔ یہ تو تھی خیال محض کی بات جس کی ذرا سی الٹ پھیر غلام کو بادشاہ کے منصب پر فائز کر سکتی ہے۔ مجرد خیال یا غور و فکر سے آگے بلکہ اس سے اہم تر ایک اور شئی ہے جسے ہم دائرۂ خیال یا دائرۂ فکر کا نام دیتے ہیں یعنی غور و فکر کا وہ ڈھانچہ جو فرد کو کائنات میں ایک معنویت عطا کرتا ہے۔ یہ دائرۂ فکر جتنا توانا ہوگا اور اس کی بنیاد جس قدر علم و آگہی پر استوار ہوگی اسی قدر فرد کے نمو اور اس کے ارتقاء کے امکانات واہوتے جائیں گے۔ قرآن مجید نے غور و فکر کے اس ڈھانچے کے لیے الدین کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اپنے ماننے والوں پر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ خدا کے نزدیک الاسلام یعنی والہانہ اور غیر مشروط سپردگی کے علاوہ کوئی اور طریقہ زندگی قابل قبول نہیں ہے۔ اسے دین حق کہتے یا دین قیم یہ جب تک اپنی اصل حالت پر قائم رہا متبعین محمدؐ اس اعتماد سے سرشار رہے کہ وہ آخری نبی کی امت کی حیثیت سے اب تاریخ کے آخری لمحہ تک امین کائنات اور اقوام عالم کی سیادت کے منصب پر فائز ہیں۔ انھیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ تاریخ کی لگام ان کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے اور اس سفر میں وحی ربانی کی تجلیاں مستقل ان کی رہنمائی کر رہی ہیں۔

نزل قرآن نے جس عقلی دائرۂ فکر کی تشکیل کی تھی اس کا منطقی لازمہ تھا کہ آنے والے دنوں میں انسانی تہذیب تسخیر و اکتشاف کی غلغلہ انگیزیوں سے گونج اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اکتشافی تحریک کے اس ربانی قافلے نے فارس و روم کی قدیم تہذیبوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہند اور یونان کے قدیم علوم بلکہ کہہ لیجئے کہ انسانی تہذیب کی کل جمع پونجی تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آئی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عالم اسلام کا وسیع و عریض خطہ اکتشافی تمدن کی ضوفشانیوں سے جگمگا اٹھا۔ حرفت و زراعت، سفر و حضر، بحر و بر، دور پر اسرار آسمانوں اور سطح سمندر کے مہیب سناٹوں میں گویا ہر طرف اکتشافی تمدن نے اپنی کمندیں کچھ اس طرح ڈالیں کہ انسانی تہذیب ایک مسرت آمیز طرب ناک یوں سے سرشار نظر آنے لگیں۔ اس دوران عالم اسلام اپنے داخلی سیاسی خلفشار، فقہی نزاعات اور مسلکی خانہ جنگیوں سے دوچار بھی ہوا، لیکن اکتشافی قافلے کو قرآنی دائرۂ فکر کے قیام سے جو ایک بار مہیمل چکی تھی سو وہ رو کے نہ رکتا تھا۔ اموی اور عباسی سلطنتیں تاراج ہوئیں۔ مسلمانوں کی سیاسی وحدت عباسی بغداد، فاطمیین کے قاہرہ اور اندلس کے امویوں میں منقسم ہو گئی۔ پھر آگے چل کر ترکوں، صفویوں اور مغلوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں عالم اسلامی کو منقسم کر ڈالا، لیکن تب بھی اس چراغ خموش میں اتنی تابانی باقی تھی کہ اس پر ایک مدت تک دنیا کو اصل روشنی کا گمان ہوتا رہا۔ سترہویں صدی کے آخر تک صورت حال یہ تھی کہ مسلمان اپنے تمام التباس فکر و نظر کے باوجود ویانا کے دروازوں پر دستک دیتے اور جرمنی، ہنگری اور اندرون یورپ کی دوسری ریاستیں ترکوں کی بیہت سے لرزہ بر اندام رہتیں۔ ایک طرف زوال پذیر سیاسی جاہ و حشم کی یہ جلوہ سامانیاں تھیں اور دوسری طرف ایک اساطیری، غیر عقلی اور غیر قرآنی دائرۂ فکر رفتہ رفتہ ہمیں اپنے نرغے میں لے رہی تھی۔ ۱۵۸۰ء میں جب علمائے اسلام کے فتاویٰ اور

عوام کے اصرار پر استنبول میں دنیا کی سب سے بڑی رصد گاہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں ڈھائی جا رہی تھی تو گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ عالم اسلام میں اکتشافی ذہن کی موت واقع ہو چکی ہے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب خدا اور انفس و آفاق کے مابین اس توازن کے ادراک سے ہم غافل ہو گئے جس کی بنا پر قرآن نے مسلم ذہن کی تعمیر کی تھی اور جس کے سبب ہمیں کائنات کسی ناقابل فہم خلق باطل کے بجائے ایک سوچا سمجھا مانوس سامنصوبہ لگتا جس میں رنگ بھرنا ہمارا کارِ منصبی تھا۔ اکتشافی ذہن سے اساطیری ذہن کی طرف ہماری مراجعت کچھ اس طرح دے پاؤں ہوئی کہ ہمارے بڑے بڑوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پایا۔ جب علوم شرعی کے حوالے سے کوئی ڈیڑھ سو سے پانچ سو آیات کو آیات احکام کے طور پر تعلیم و تعلم کے لیے منتخب کیا جا رہا تھا اور بقیہ قرآن یا آیات اکتشاف ہمارے محور و مرکز سے معطل کی جا رہی تھیں، اس وقت شاید کسی کو یہ اندازہ نہ رہا ہو کہ آنے والے دنوں میں آیات اکتشاف کی معطلی ہم پر ایک اساطیری اور غیر عقلی طرز فکر کا دروازہ کھول دے گی۔ علم شرعی کا تصور فی نفسہ ایک بحرانی تاریخ کا پیدا کردہ تھا۔ کسے پتہ تھا کہ علم کی ثنویت آنے والے دنوں میں ایک دائمی اور تقدیری حیثیت حاصل کر لے گی۔ اپنے عہد میں شافعی اور مالکی حلقے اوزاعی، ثوری اور طبری حلقوں سے مختلف نہ تھے، پھر کسی کے ذہن میں یہ بات کیسے آتی کہ آنے والے دنوں میں دوسرے ائمہ کے حلقے یا ان کا مدرسہ فکر تو تاریخ کے صفحات میں گم ہو جائیں گے، البتہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی خیموں کو دائمی فقہی حوالوں کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح جو لوگ قواعد القرآن اور مجرب آیات کے حوالے سے قرآن کے اصل پیغام اور اس کی جلالت پر پہرے بٹھا رہے تھے اس کی اصل سنگینی کا اندازہ کرنا بھی ان ایام میں مشکل تھا جب اکتشافی ذہن کا سفر ان تمام مزاحمتوں کے باوجود جاری تھا۔ آگے چل کر تعویذ و طلسم نے ہمارے عقلی طرز فکر کو اس حد تک پراگندہ کر دیا کہ عثمانی خلفاء نے دافع بلیات اور حفاظت کی خاطر اپنے ملبوسات پر قرآن مجید نقش کروانا عین دینی عمل جانا۔ آیات قرآنی کے طلسماتی خواص کی عمومی اشاعت اور مقبولیت سے عالم اسلام کا کوئی خطہ خالی نہ رہا۔ البتہ جب ختم بخاری کی ہر تقریب دشمن کے حملوں کو پسپا کرنے میں ناکام رہی تو ہمیں اندازہ ہوا کہ زمین ہمارے پیروں سے نکل چکی ہے اور ایک اساطیری طرز فکر نے پوری طرح ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ حاملین قرآن کے ہاتھوں انکار قرآن کے اس سنگین جرم کے بعد منصب سیادت سے ہماری معطلی فطری تھی۔

دوسری طرف صقلیہ اور اندلس کے دریچوں سے آنے والا اکتشافی طرز فکر عیسائی یورپ کو مسلسل ایک انبساط انگیز کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔ دسویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک علوم عربیہ یعنی اکتشافی علوم کی کتابیں مسلسل لاطینی اور دوسری مقامی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کے علم و تمدن نے عیسائی یورپ کی کچھ اس طرح تقلیب کی کہ اکتشافی علوم تو کجا وہاں مذہب اور مطالعہ مذہب کے طور طریقے بھی یکسر بدل کر رہ گئے۔ پروٹسٹنٹ تحریک کے نتیجے میں چرچ کو بالآخر اصلاح کا آغاز کرنا پڑا۔ ایک بار جب فکر و نظر کے پرانے ڈھانچے پر سوالیہ نشان لگ گیا تو آنے

والے دنوں میں مختلف قسم کی فکری اور سیاسی تحریکوں حتیٰ کہ بائیںیل کے طالب علمانہ اور تنقیدی مطالعہ کی گنجائش بھی پیدا ہوگئی۔ گویا یہ کہہ لیجئے کہ مشرق میں جب اکتشافی قافلہ مست خرامی کا شکار تھا، اسی دوران عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں نے مغرب کو ایک طربناک کیفیت سے دوچار کر رکھا تھا۔ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد تو صورت حال کچھ ایسی ہوگئی گویا ہر طرف سے

آ رہی ہو دام صدائے کن فیکوں

یہی وہ عہد ہے جب منصب سیاست سے خود ہمارے ہاتھوں ہماری معطلی عمل میں آئی اور ہمارے غیاب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب نے اپنی مفروضہ تاریخی عظمت و سطوت اور نسلی برتری کا اسطورہ تراشا اور یہی وہ عہد ہے جب سرمایہ داری کے ہاتھوں اکتشافی تحریک کے استحصال کا عمل شروع ہوا۔ مکروہ استعمارانہ عزائم نے مغرب کو نئی تاریخ لکھنے پر مجبور کیا۔ نئے سماجی اور عمرانی علوم وضع کیے گئے جن کا مقصد وحید مغرب کی سفید فام اقوام کی تہذیبی برتری اور ان کے تہذیبی مشن کے تبلیغ و توسیع کو جو افرام کرنا تھا۔ انیسویں صدی کا یہ پروپیگنڈہ اتنا پرشور اور ہنگامہ خیز تھا کہ اس ہنگامے میں کسی متبادل نقطہ نظر کے سننے اور سمجھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مغل ہند سے لے کر خلافت عثمانی کی وسیع و عریض سر زمین اس موج بلاخیز کی زد میں تھی۔ مزاحمت کی تحریک میں جو لوگ اصحاب سیف کی حیثیت سے سامنے آئے ان کے پاس اتنا موقع کہاں تھا کہ وہ علمی دلائل و براہین کی نئی جوت جگاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد عالم اسلام کے مغرب (Westernized) اہل دانش یہ سمجھنے لگے کہ جدید دنیا جیسی کہ وہ ہے اسے مغرب نے بنایا ہے۔ مغرب ہی تہذیب کا فطری اور ازلی امام ہے، جس کی اتباع میں اقوام مشرق کی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے نہ صرف یہ کہ علامتی عثمانی خلافت دنیا کے نقشہ سے غائب ہوگئی بلکہ مغرب کی دانش گاہوں نے ہر طرف شرق و غرب میں ایک ایسی صورت حال کو جنم دیا جسے knowledge blindness کا نام دیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر اس صورت حال کو عوامی ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں کچھ ایسا استحکام حاصل ہوا کہ مشرق و مغرب ہر طرف نا آگہی کی ایک عمومی کیفیت پیدا ہوگئی۔ media blindness کے اس عمومی ماحول میں اب دنیا پوری طرح سرمایہ داروں کے شکنجہ میں تھی۔ خود مغرب کے باسی اصل صورت حال سے ناواقف سرمایہ داروں اور کارپوریٹ کی پیدا کردہ مصنوعی صورت حال پر اصل کا گمان کرتے رہے، تا آنکہ اکیسویں صدی کی ابتداء میں social media کے جھٹپٹے میں سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ رخ کا عام لوگوں کو کسی قدر اندازہ ہونے لگا۔

گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں سے جب سے دنیا پر مغرب کی مکمل اجارہ داری قائم ہوئی ہے، ایک قسم کی عمومی نا آگہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ہمارے متجددین اور مغرب زدہ علماء یہ کہتے نہیں تھکتے کہ جدید تہذیب کی چمک دمک بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ نئی سائنس کا ظہور اہل مغرب کی رہین منت ہے۔ روایتی علماء بھی اس مفروضہ کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ مدت سے ان کا محور فکر و عمل چند فروغی اور نزاری معاملات رہے ہیں، پھر انھیں اس نئی نا آگہی اور بنی بر پروپیگنڈہ علوم کی اصل حقیقت کا ادراک

کیسے ہو۔ خود مغرب میں سرمایہ داری کے ہاتھوں فرد پر تعذیب کے شکنجے مسلسل سخت ہوتے رہے ہیں۔ ایک بھر پور نشاط افزا زندگی اور حریت فکر و نظر کی بخشش ماضی کا فسانہ بن چکی ہیں۔ زندگی معنویت سے کچھ اس طرح خالی ہوئی کہ اہل مغرب ایک طرح کے احساسِ مابعدیت کے تلے زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہو۔ تہذیب جو کبھی یہاں خیمہ زن تھی اب رختِ سفر باندھ چکی ہو اور ہمارے حصے میں ایک ویران خرابے کے علاوہ اور کچھ نہ آیا ہو۔

یہ عہد تار یک جس میں آج ہم جینے پر مجبور ہیں، اس کا الزام صرف مغرب کے سر نہیں دیا جاسکتا۔ دسویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک مغرب نے تاریخ کا سفر ہماری اتباع اور شاگردی میں طے کیا۔ سترہویں صدی میں وہ حریف کے طور پر سامنے آیا۔ اٹھارویں صدی تک قوت کا توازن کسی حد تک قائم رہا، البتہ انیسویں صدی میں منصبِ سیادت سے ہماری مراجعت کے سبب خود اہل مغرب کے لیے وہ فکری اور نظری سہارا باقی نہ رہا، جس کے حوالے سے اب تک تاریخ کا سمتِ سفر متعین ہوتا آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے زوال اور غیاب کے سبب ساری دنیا ایک طرح کی ہلامارنے والی بے سمتی کا شکار ہو گئی۔ آج اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ تہذیب کا سائنسی قالب جس کے دم سے جدید دنیا کی چمک دمک قائم ہے، ہمارے اکتشافی طرز فکر کی پیداوار ہے، جس کی جڑیں کہیں اور نہیں بلکہ عین وحی ربانی کے صفحات میں پائی جاتی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں جب ایمینوئل کانٹ نے مغرب میں پہلی مرتبہ Weltanschauung کی اصطلاح استعمال کی تو کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہوئی کہ اس سے پہلے اہل مغرب فلسفہ زندگی کے کسی تصور سے نابلد تھے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب ۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ ولیم ویول نے اکتشافی علماء کے لیے سائنسٹ کی اصطلاح وضع کی تو مشرق و مغرب ہر جگہ یہ سمجھا جانے لگا کہ Scientist کا وجود فی نفسہ مغرب الاصل ہے اور اسے مغرب کی جدید سائنسی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ جب تک اکتشافی علوم کے لیے علومِ عربیہ کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی یہ تاثر عام تھا کہ سائنسی تہذیب کا عربوں یا مسلمانوں سے رشتہ گہرا ہے، البتہ جب اکتشافی علماء کے لیے سائنسٹ یا سائنس دان کی اصطلاح چل نکلی تو ہمارے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ ہماری فکر و تہذیب سے اس نئی مخلوق سائنسٹ کا بھی کبھی کوئی تعلق رہا ہے۔

یہ کتاب کوئی دانشورانہ تاریخ نہیں، گو کہ اس کو پڑھتے ہوئے ایک نئی دانشورانہ تاریخ کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو سکتا ہے۔ اختصاص فن کے اس ماحول میں جہاں اہل دانش کی تمام تر توجہ اپنے مخصوص فن تک محدود ہوتی ہے، ایک ایسی تاریخ جو نزولِ قرآن کے بعد تہذیب کے جملہ ابعاد کو متصور کر سکے کچھ آسان نہیں۔ یہ کام فی نفسہ بڑا اہم ہے جو ہمارے تقدیری اور تجدیدی دونوں قسم کے علماء کے لیے چشم کشا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں ہم نے عہد بہ عہد کے مختلف وثیقہ ہائے جات اور تاریخی حوالوں کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک ہم اکتشافی طرز فکر کے حامل رہے، اقوامِ عالم کی بلا شرکتِ غیرے قیادت و سیادت ہمارے ہاتھوں میں رہی، البتہ جب اساطیری طرز فکر نے ہمیں آلیا تو ہمارے لیے ممکن نہ رہا کہ اس اکرام و فضیلت پر تادیر اپنا قبضہ برقرار رکھ پاتے۔ قرآن مجید تو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے

لیکن تقدیس و تکریم کے پردے میں ہم نے اس کی معطلی کا پختہ انتظام کر رکھا ہے۔ ہمارے ارد گرد مذہبی زندگی کی بساط کچھ اس طرح سجائی گئی ہے جس نے عملاً مذہب کے لبادے میں دین کی نفی اور قرآن کے انکار کا ماحول قائم کر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہبی زندگی کی چہل پہل اور تجدید و اصلاح کے فلک شگاف نعروں کے باوجود ہم پر ایک نئی صبح طلوع نہیں ہوتی۔ سمت سفر کی درستگی کے لیے لازم ہے کہ ہم سب کچھ از سر نو شروع کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ ایک نئی ابتداء کے لیے مروجہ فہم دین کے از سر نو محاکمہ کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ کام اس وقت تک بمکمال احتیاط انجام نہیں پاسکتا جب تک کہ خود قرآن مجید کو اس دانشورانہ مناقشے کی کمان نہ سونپ دی جائے۔

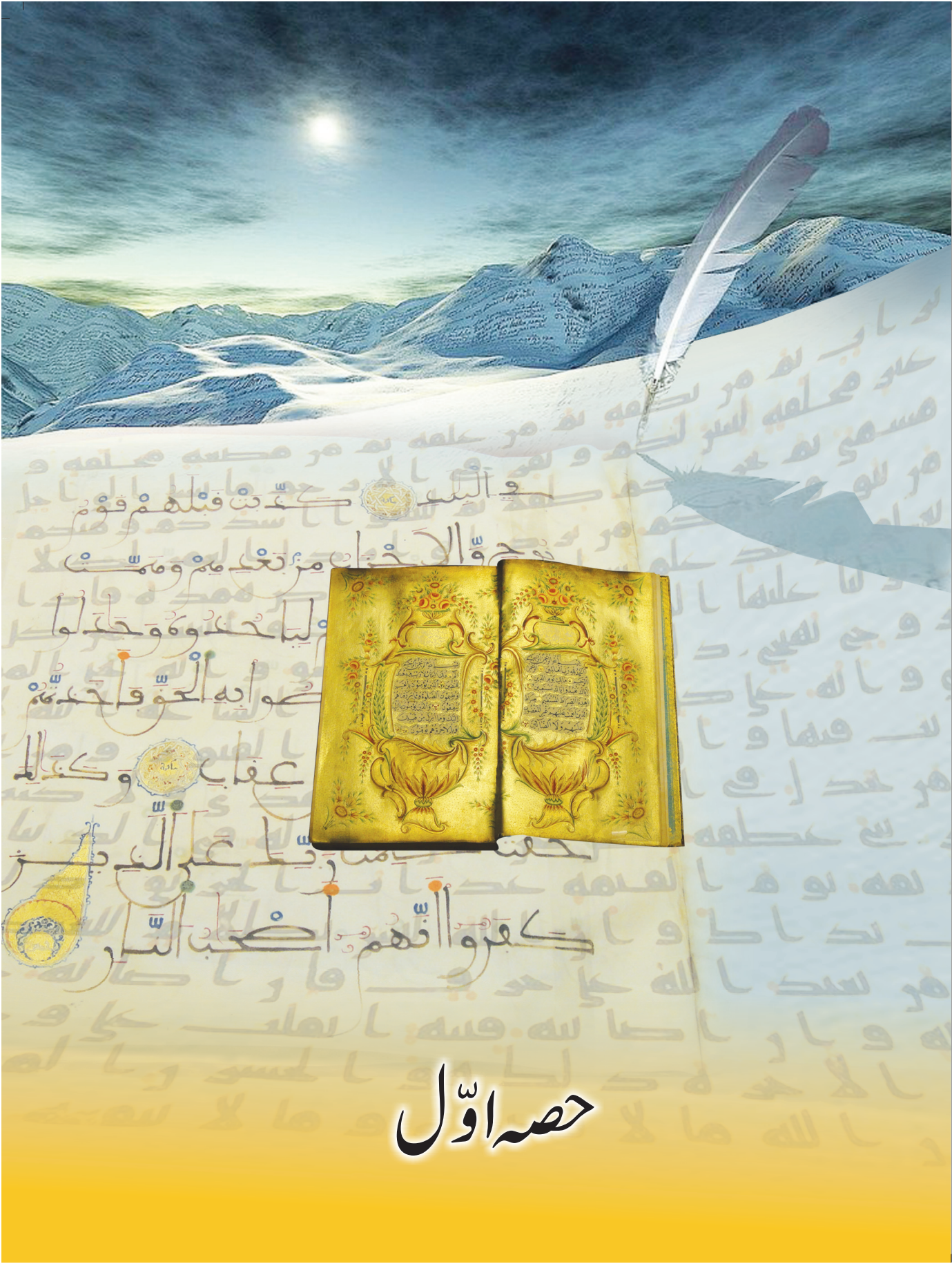
راشد شاز

یکم جنوری ۲۰۱۲ء، علی گڑھ



ملفوظ

اس کتاب کا پہلا باب ادراک دوم سے مانجوز ہے۔ اس کے بغیر اکتشافی تحریک کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنا مشکل تھا۔ کتاب کا مصور اور نگین ہونا بھی دراصل اس مجبوری کے تحت ہے کہ جو بیٹیکنگ اور وثائق یہاں معرض بحث ہیں ان کی ایک جھلک دیکھے بغیر نہ تو تفہیم کا حق ادا ہو سکتا تھا اور نہ ہی قاری میں اعتماد کی وہ کیفیت پیدا ہو پاتی جو ان وثائق کے یکشم خود ملاحظہ سے ہو سکتی ہے۔



حصه اول



قرآن مجید صرف اوامر اور نواہی کی کتاب نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی ذہن کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی سے متصف کرنے والی ایک ایسی شاہ کلید ہے جس سے امکانات کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں۔ آج مغرب ہی کیا ساری دنیا میں علم و فن کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں ان سب کی اساس اسی قرآنی دائرہ فکر میں پائی جاتی ہے جس نے کائنات پر غور و فکر کو ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت دی اور پھر تمام علوم حاضریہ اور متقدمہ سے اکتساب کا فن سکھایا۔ نفس و آفاق پر غور و فکر کی یہ دعوت ایک ایسے وحی آمیز عقلی رویے سے عبارت ہے جس سے غیاب پیگیری میں رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا کام لیا جاتا رہے گا۔

الہامی تصورِ حیات کے جلو میں

{وما اوتیتکم من العلم الا قليلا}

مکہ سے کوئی دو میل دور غارِ حرا کی تنہائی میں محمدؐ بن عبد اللہ ان عظیم سوالات سے نبرد آزما تھے جو ازل سے قدسی نفسوں کی توجہ کے محور و مرکز رہے ہیں۔ خدا کیا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اور کون ہے وہ ہستی جس کے وجود سے مکاں اور لامکاں کی تخلیق عبارت ہے؟ یہ کیسا بھید ہے جس کی سریت کا انکشاف اس کی سریت میں مزید اضافہ کرتا جاتا ہے۔ خدا کا تجربہ اگر خلا قانہ ہو تو وہ انسان کو تسخیر کائنات کے فریضہ پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اگر مقلدانہ ہو تو انسانی ذہن {وجدنا ابانا کذا لک یفعلون} کے پیدا کردہ توہمات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یہی تجربہ اگر تکبر و غرور کے آمیزے سے تشکیل پائے تو بغاوت اور سرکشی کو جنم دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو انسانی تاریخ کا تمام عروج و زوال اسی ایک نکتہ کی تشریح و توضیح سے عبارت ہے۔ دنیا کے تمام تصورِ حیات اور کائنات کے سلسلے میں تمام انسانی مفروضوں کی ابتداء اور انتہاء اسی ایک نکتہ پر آ کر مرکوز ہو جاتی ہے۔

محمد بن عبد اللہ خانوادہ براہمی کی ہاشمی شاخ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ ان کے قبیلہ قریش کو متولیانِ کعبہ کی حیثیت سے روحانی پیشواؤں کا مقام حاصل تھا۔ کعبہ کی دیکھ ریکھ اور معیاری انتظام و انصرام کے سبب مکہ کو ایک تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ روحانی اور تجارتی سیر و سیاحت کی یکجائی کے سبب اطراف و اکناف کی دولت مکہ میں کھنچی چلی آتی تھی۔ خدا ہالیاں مکہ کے حسی تجربے کا اب حصہ رہا ہو یا نہیں البتہ یہ بات ہر خاص و عام پر عیاں تھی کہ دین براہمی کی تجارت اور اس کی فنکارانہ ترغیب و تخریص نے وادی غیر ذی ذرع میں رہنے والوں پر آسائش کے وافر امکانات واکردیے ہیں۔

محمد اہل مکہ کے اس مکروہ کاروبار مذہب سے سخت متنفر تھے جہاں دین براہمی کی باقیات کے نام پر بے مغز رسوم اور توہمات کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ دین براہمی کی اساس کھوئی گئی ہے اور یہ کہ دین کے نام پر مکہ کی یہ چمک دمک کاروبار دین داری سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن زید بن عمرو جو کعبہ کی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اہل قریش سے یوں مخاطب ہوئے: ”اے قریش! اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے تم میں سے ایک شخص بھی ابراہیم کے دین پر عامل نہیں ہے سوائے میرے۔ پھر وہ تاسف بھرے انداز میں یوں گویا ہوئے بارالہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے تو میں ضرور اسی طرح تیری عبادت کرتا لیکن افسوس کہ میں اس بات سے آگاہ نہیں۔“

تصور توحید کے پس پشت چلے جانے کے سبب اہلایان مکہ اور دیگر قبائل عرب بدترین قسم کے توہمات سے دوچار تھے۔ اہم معاملات میں وہ اپنے دل و دماغ کے بجائے خشب و حجر کے تراشیدہ بتوں سے رہنمائی کے طالب ہوتے اور پھر جو اشارے حاصل ہوتے اس کے مطابق عمل کرتے۔ اس توہم پرستی نے اہل مکہ کو ایک ایسی بندگی میں پہنچا دیا تھا جہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہ دیتی تھی۔ {وَجَدْنَا ابْنَآءَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ} کی گونج میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور تحلیل و تجزیہ کی قوت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

جب دین مذہب یا تجارت بن جائے اور مذہب سے مادی منفعت کا کام لیا جانے لگے تو پھر حق و باطل کا تراشیدہ معیار بھی ڈانواؤں ہونے لگتا ہے۔ اہل مکہ حلت و حرمت کے فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ جب چاہا اپنی منفعت کے لیے حرام مہینوں کو مؤخر یا مقدم کرنے کا اعلان کر ڈالا اور اس طرح روایتی دین داری یا سنن معروف کے قدموں سے بھی ثبات کا پتھر کھینچ ڈالا۔ مکی سرمایہ داری اور قرشی پیشوائی استحصال کی اس معراج پر جا پہنچی تھی جہاں غیر شعوری طور پر وہ خود اپنی بنیادوں پر تیشہ چلا رہی تھی۔ روحانی پیشوائی ہو یا استحصالی سرمایہ داری اس کی مثال ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کی طلب ایک مرحلے میں اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اُسے زندہ رہنے کے لیے خود اپنے آپ کو نوالہ تر بنانا پڑتا ہے۔ یہی وہ بندگی تھی جس میں ماقبل اسلام کا انسانی قافلہ پھنس کر رہ گیا تھا۔

بندگی کے عمومی احساس نے قیافہ شناسوں اور مستقبل بینوں کے لیے اشارات و امکانات کی ایک نئی دنیا روشن کر دی تھی۔ خبر گرم تھی کہ نئے نبی کی آمد کا زمانہ اب قریب آ پہنچا ہے۔ بعض حضرات رسول موعود کی تلاش میں مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔ پھر اس امید پر کہ شاید مستقبل کے نبی کا ظہور مکہ میں ہو وہ مکہ لوٹ آئے۔ ان میں سے ہی ایک زید بن عمرو تھے جو بعثت محمدی سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ اس کے علاوہ عثمان بن حریث، عبید اور ورقہ بن نوفل راہ حنیف کے متلاشیوں کی حیثیت سے مکہ میں معروف تھے۔ گویا ایک عمومی بے چینی اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے جب پردہ غیب سے وہ سب کچھ ظاہر ہو جس کے بارے میں عرصہ ہائے دراز سے اہل فکر و نظر سرگوشی کیا کرتے تھے۔

یہ وہی ایام تھے جب محمد بن عبد اللہ غار حرا میں ان سوالات سے نبرد آزما تھے جو کبھی ابوالانبیاء ابراہیم کی ہم کلامی کا موضوع رہا تھا۔ ابراہیم کو آفتاب کے طلوع و غروب، اس کی قوت و حرارت اور اس کی سریت پر اس غیر مرئی قوت کا گمان ہوتا جس نے اس مہیب کائنات کو رنگ و بو عطا کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بہت جلد ابراہیم کی ہم کلامی اور تلاش حق کی مساعی نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا کہ قوت کی ان علامتوں کے آگے سجدہ ریز ہو جانا فکر و نظر کی موت ہے۔ ابراہیم کی ہم کلامی کی طرح محمد کی خلوت نشینی بھی ایک مسرت انگیز اور انقلاب آفریں تجربے سے دوچار ہوئی۔ حراء میں جو کچھ ہوا اس نے آنے والے دنوں میں دنیا کی تاریخ بدل دی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات جب محمد غار حراء میں سوئے تھے وہ ایک طرب انگیز تجربے سے دوچار ہوئے، نہ تو یہ خواب تھا اور نہ ہی عالم بیداری بلکہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کے واقعی بیان سے انسانی زبان عاجز ہے۔ بقول محمد رسول اللہ: ”میں سویا ہوا تھا کہ جبریل میرے پاس حریری رومال میں لپیٹ کر ایک کتاب لائے اور کہا کہ اسے پڑھئے۔“ جبریل کی اس اچانک آمد سے آپ خوفزدہ ہو گئے سو جبریل نے ایک ہاتھ آپ کے سینے پر اور دوسرا پیٹھ پر رکھا اور دعا کی: **الھم احطط وزرہ و اشرح صدرہ و طهر قلبہ**۔ پھر آپ کو بشارت دی کہ اے محمد مبارک ہو کہ آپ اس امت کے نبی ہیں: **لا تخف یا محمد! جبریل رسول اللہ جبریل رسول اللہ الی انبیائہ و رسلہ فایقن بکرامۃ اللہ فانک رسول اللہ**۔ پھر آپ کو یہ آیات پڑھائیں: **{ اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم }**۔

سورہ علق کی ان آیات میں اگر ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی دی جا رہی تھی کہ آپ کا رب اکرم ہے جس نے انسان کو قلم کا استعارہ عطا کیا اور اسے وہ کچھ بتایا جس کا اسے علم نہ تھا تو دوسری طرف اس بات کا اشارہ بھی کہ اب لذت گوشہ نشینی کے دن ہوا ہو چکے۔

جبریل تو واپس چلے گئے البتہ وہ محمد رسول اللہ پر اس مسرت انگیز اور مہیب تجربے کا لافانی نقوش چھوڑ گئے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے جبریل نے یہ تحریر آپ کے سینے میں لکھ دی ہو۔ حراء کے اس تجربہ نے محمد بن عبد اللہ کو اب محمد رسول اللہ

کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اب ان کے کاندھوں پر اقوام و ملل کو راہ یاب کرنے کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس تجربے کے بعد آپ دوبارہ غارِ اعراء کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔

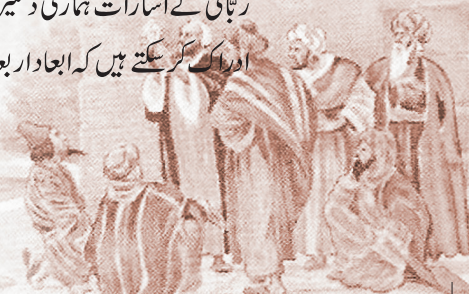
الہامی دائرہ فکر کی تشکیل

نئی وحی کی آمد ایک نئے دائرہ فکر سے عبارت تھی۔ انسان اور خدا، کائنات اور اس کی ابتداء و انتہا سے متعلق تمام تر سوالوں کا مکشوف و مربوط مکالمہ اب آئندہ تینیس^{۲۳} سالوں تک قرآنی وحی کی شکل میں جاری رہنا تھا۔ قرآن مجید نے ان پر اسرار اور مہیب سوالوں سے سریت کی نقاب یکسر تو نہیں الٹی ہاں یہ ضرور کیا کہ انسان کو اس مہیب سریت سے بڑی حد تک ہم آہنگ اور مربوط کر دیا۔ اب کائنات پر اسرار خوف و دہشت کا استعارہ نہیں رہ گئی تھی جس کے مظاہر کے آگے سجدہ ریزی کی ضرورت محسوس ہو بلکہ یہ سب کچھ اس خالق کی عظیم صنایع کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ گویا اب تک جو لوگ فطرت کی پرستش میں مبتلا تھے وہی لوگ اس پر اسرار کائنات کو خدائے واحد کے تخلیقی استعارے کے طور پر دیکھنے اور برتنے کی کوشش کرنے لگے کہ اب کائنات کوئی معممہ نہیں بلکہ خالق کل کا تعمیر کردہ ایک ایسا زمان و مکان تھا جس کے اندر رنگ بھرنے کا بنیادی فریضہ حاملین وحی کو انجام دینا تھا۔

اکتشافی ذہن کی تشکیل

نئے مسلم ذہن کی بنیاد نہ تو محض عقل پر رکھی گئی اور نہ ہی اسے کسی اساطیری طرز فکر کا خوگر بنایا گیا بلکہ سچ پوچھے تو عقل کے ہاتھ میں وحی کی کتاب سر تھما دی گئی۔ اس طرح وحی ربانی کے جلو میں مطالعہ فطرت کے ذریعے علم و آگہی کا ایک نیا علم وجود میں آ گیا۔ وحی کا سرّ یا راز کائنات کے منکشف ہو جانے سے پہلی نسل کے مسلمان غیر معمولی اعتماد سے سرشار نظر آئے۔ انھیں فی الواقع ایسا محسوس ہوا گویا قرآن مجید نے مستقبل کی کمان ان کے ہاتھوں میں تھما دی ہو۔ اور یہ کہ وہ غیاب پیسر میں بھی تمام کمال مستقبل کے انسانی قافلے کی منزل نوائی کے اہل ہیں۔

نئے دائرہ فکر کی بنیاد وحی، انفس اور آفاق کے ارکان ثلاثہ پر رکھی گئی۔ اس نکلون سے محض سریت کے حجاب کو چاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انسان کو اس مہیب کائنات میں اپنے مقام سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا بھی کہ کائنات کا بھید یکسر ناقابل فہم نہیں۔ قرآنی ذہن کے ابعاد نے سائنسی طرز فکر میں متشکل نہیں ہو سکتے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ اشیاء کی ماہیت کا محض ایک ڈامنشن ہے، سو جہاں انسان کا مشاہدہ اس کا ساتھ نہ دے سکے وہاں حقیقتِ نفس الامر کی تلاش کے لیے وحی ربانی کے اشارات ہماری دستگیری کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم حقیقتِ نفس الامر کا تمام تر ابعاد کے ساتھ ادراک کر سکتے ہیں کہ ابعادِ اربعہ کے حاملین کے لیے ان ابعاد سے ماوراء حقائق کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں ہم اتنا ضرور کر



فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
مَنَّوْنَا عَلَىٰ مَنَّا
إِنَّهُ مَوْلَاكَ بِغَيْرِ مُدَارَاةٍ
اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سکتے ہیں کہ آیات کائنات میں ان عظیم تخلیقی استعاروں کو پڑھ سکیں جو عقل محض کے حاملین کے لیے بالعموم ممکن نہیں ہے۔ یہ لوگ جو کائنات کی مہیب وسعت پر غور و فکر سے عاجز ہیں اور جن کا چشم تصور اور وجدان کائنات میں ہر لمحہ برپا معرکہ ہے۔ {کن فیکون} سے نا آگاہ ہے تو یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کے پاس قلوب ہیں لیکن فہم سے خالی، آنکھیں ہیں مگر بصیرت سے خالی، کان ہیں مگر سماعت سے محروم۔ یہ لوگ دراصل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے {اولئک ہم الغافلون} {اعراف: ۱۷۹}۔ وحی ربانی نے ہانکے پکارے قلب و نظر کے استعمال کی دعوت دی اور اس فریضہ میں کوتاہی برتنے والوں کو دردناک انجام سے متنبہ کیا: {والذین سعوا فی آیتنا معجزین أولئک اصحاب الجحیم} (ج: ۵۱)۔ ایسا اس لیے بھی کہ کائنات کے اسرار و رموز سے منہ موڑ کر زندگی جینے والوں کو دنیا ایک تنگ و تاریک گھاٹی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ آیات اللہ کی تفہیم سے دور ہونا گویا تسخیری اور اکتشافی صلاحیتوں سے محروم ہو جانا ہے۔ جو قوم اس صریح کافرانہ رویے کو اپنا شعار بنا لیتی ہے اسے دنیا میں ذلت کا عذاب تو جھیلنا ہی پڑتا ہے آخرت میں بھی کم سوادی اس کا مقدر بن جاتی ہے {ومن کان فی ہذہ اعمیٰ فہو فی الآخرۃ اعمیٰ}۔

نئے مسلم ذہن کے لیے کائنات اب کوئی عقدہ لا ینخل نہیں بلکہ ایک انتہائی پیچیدہ اور منصوبہ بند تخلیقی عمل سے عبارت تھا۔ وحی ربانی خاص طور پر اولوالباب یا اولوالنہی کو خطاب کرتی جنہیں انفس و آفاق میں آیات ربی کی جلوہ سامانیوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔ ینظرون، یتفکرون، یسمعون، یتدبرون، یتذکرون، یعقلون، یفقیہون، یعلمون اور ان جیسے ہم معنی الفاظ کی تکرار اور اس عمل پر اصرار نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اب انسانی معاشرے میں وجدنا آبائنا کذا لک یفعلون کی بند دماغی پر ہمیشہ کے لیے مہر استرداد لگ جائے۔ نئے دائرہ فکر میں عقل چونکہ وحی کی ضد نہیں بلکہ اس کی معاون و مشیر تھی اور رہنما بھی، سو بشارت دی گئی کہ جوں جوں عقل ترقی کرتی جائے گی وحی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت پر یقین واثق ہونا جائے گا: {سنریہم آیتنا فی الافاق و فی انفسہم۔۔۔ الخ} {فصلت: ۵۳} اس آیت میں مستقبل کا صیغہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی آیات کی عقدہ کشائی ماضی اور حال سے کہیں زیادہ مستقبل میں ہوگی۔ آج جو چیزیں اہل مشاہدہ کے لیے محض اپنی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں کیا عجب آنے والے دنوں میں مشاہدہ کے نئے وسائل اسے ممکن بنا دیں۔ قرآن مجید کا نزول گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب غور و فکر کا وہ انقلابی منہج انسانوں کی دسترس میں ہے جس کا برتنا ان کے لیے اگر ایک طرف ایک عقلی رویے کی تشکیل میں مہمیز ہو سکتا ہے تو دوسری طرف خود اس کتاب کے برحق ہونے پر ان کے ایقان میں اضافے کا سبب بھی، جیسا کہ ارشاد ہے: {کتب انزلنہ الیک مبرک لیدبروا بآیتہ ولیتذکروا لوالالباب} {ص: ۲۹}۔

قرآنی دائرہ فکر اور الکتاب

ایک مختصری تمہیدی دعا کے بعد قرآن مجید کی ابتداء کتاب فطرت پر غور و فکر کی دعوت سے ہوتی ہے۔ قرآن اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر صدق دلی سے کتاب فطرت کا مطالعہ کرے گا ہدایت اس کے حصے میں آئے گی کہ ہدایت تو ہے ہی متقیوں کے لیے۔ یہ متقی بے سوچے سمجھے اندھے عقائد پر ایمان لانے والے نہیں بلکہ آیات کائنات کے گہرے شعور سے متصف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مرنی حقائق پر ایمان لاتے، صلوٰۃ قائم کرتے اور جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن {اولئک ہم المفلحون} سے خطاب کرتا ہے۔ ان ابتدائی آیات کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت دراصل کتاب فطرت کی کلید کی ہے۔ البتہ قرآن کو محض سائنسی اشاروں کی کتاب سمجھنا اس کی واقعی حیثیت کا صحیح تعین نہیں کہ قرآن مجید کی منزل تسخیر و اکتشاف سے کہیں آگے اس لازوال مسرت کا حصول ہے جس کا صحیح اندازہ ابدیت بلا حدود میں داخلے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا اور جسے قرآن لقائے ربی کے مسرت انگیز امکان سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ علم الکتاب میں ہماری دسترس یا اسرار فطرت سے آگہی ہمیں انسان، خدا، کائنات اور ان جیسے بے شمار اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ قوانین فطرت سے آگہی اور اس کی تسخیر عام انسان کے لیے بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح دربار سلیمان میں علم الکتاب رکھنے والے اس شخص کے لیے تھی جس نے چشم زدن میں طی الارض یا (Teleportation) کے ذریعہ ملکہ سبا کا تخت آئین واحد میں حاضر کر دکھایا تھا۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیچرل سائنس یا علم الکتاب ایک ایسے عقلی رویے کا منطقی نتیجہ ہے جو کائنات کو خدا کی عظیم نشانیوں کے طور پر دیکھتا اور اسے کمال شکر و احتیاط کے ساتھ برتنے کا خود کو سزاوار سمجھتا ہے، اور جو اس نکتہ سے بھی نا آگاہ نہیں کہ ے

اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قرآن مجید صرف اوامر اور نواہی کی کتاب نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی ذہن کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی سے متصف کرنے والی ایک ایسی شاہ کلید ہے جس سے امکانات کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا طالب علم جب ان آیات سے گزرتا ہے {وسخر لکم مافی السموات و مافی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون} {الحاشیہ: ۱۳} یا {سخر لکم الشمس والقمر دائبین} {ابراہیم: ۳۳} یا {انا جعلنا ماعلی الارض رینۃ لہا لنبلوہم ایہم احسن عملاً} {کہف: ۷} تو وہ ایسے اعتماد سے سرشار ہوتا ہے جس کا حال چھپائے نہیں چھپتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے {الذین یدکرون اللہ قیاماً وقعوداً علیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار} {آل عمران: ۱۹۱}۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان جہازوں میں جن کی سمندر میں روانی انسانوں کی

منفعت کے لیے ہے اور اس بارش میں جو اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے جس سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف قسم کے حیوانات میں جو زمین میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کی تبدیلی اور ابر میں جو زمین و آسمان کے مابین مسخر کئے گئے ہیں دراصل ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں (البقرہ: ۱۶۴)۔ ارض و سموات اور مابینہما پر غور و فکر کی دعوت دراصل سرا اسرار سے آگہی کا ایک وسیلہ ہے۔ انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور دل و دماغ تعصبات سے آلودہ نہ ہوں تو وحی ربانی کی تجلیاں غیاب محمدیؐ میں بھی کفایت کرتی رہیں گی۔ ایسا اس لیے کہ آخری پیغمبر کی عدم موجودگی میں بھی انفس و آفاق میں پھیلی خدا کی نشانیاں سلیم الطبع قلوب سے یہ کہتی رہیں گی:

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس سے رنگ برنگے پھل پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کی وہ دھاریاں جو سفید، سرخ اور سیاہ کے مختلف آمیزے ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف اہل علم ہی اس سے خشیت کرتے ہیں۔“ (فاطر: ۲۸، ۲۷)

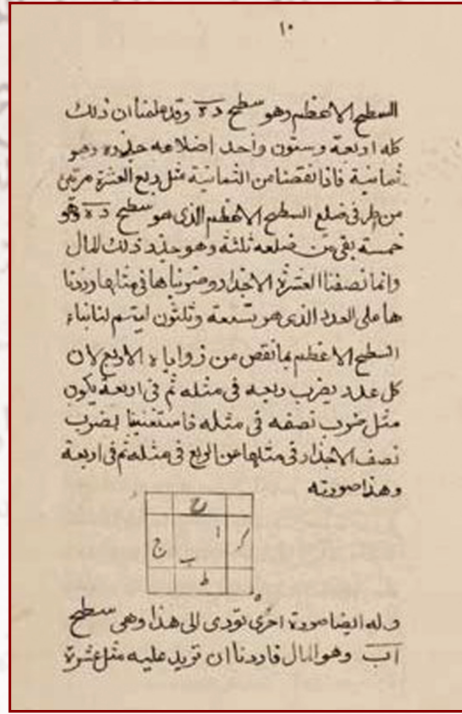
انفس و آفاق پر غور و فکر کی یہ دعوت ایک ایسے وحی آمیز عقلی رویے سے عبارت ہے جس سے غیاب پیغمبری میں رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا کام لیا جاتا رہے گا۔

اکتشافی علوم کا ارتقاء

وحی ربانی نے کتاب فطرت پر غور و فکر کی ریت کیا قائم کی، اس طرز فکر نے بہت جلد مسلم ذہن کو تحلیل و تجزیے اور تسخیر و اکتشاف کی راہ پر ڈال دیا۔ اب تک استقرائی منہج (inductive) کو انسانی علوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح علم کا منہج بڑی حد تک استخراجی (deductive) ہو گیا۔ غور و فکر کے سانچے میں یہ فی نفسہ اتنی بڑی تبدیلی تھی جس نے بہت جلد انسانی تہذیب کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ دین مبین کی فطری اٹھان جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے سبب متبعین محمدؐ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کتاب فطرت سے آنکھیں بند کر پاتے۔ روزِ اول سے متبعین محمدؐ اس بات سے آگاہ تھے کہ کعبہ مشرفہ صرف ان کا قبلہ نماز ہی نہیں بلکہ وحدت ملی کا علامہ بھی ہے۔ سو یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مختلف بلا و امصار میں تعین قبلہ کے لیے صحیح طریقہ کار کیا ہو؟ فلکیات کا گہرا علم بالکل اولین مرحلے میں مسلمانوں کی دینی ضرورت بن گیا۔ پھر یہ کہ مختلف بلا و امصار میں نمازوں کے نظام الاوقات کا تعین جغرافیہ کی وسیع معلومات اور فن نقشہ نگاری میں مہارت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ قرآن مجید میں شمس و قمر کی گردش جن مقاصد کے تابع بتائی گئی ان میں ایک مقصد { لتعلموا عدد السنین والحساب } بھی تھا (یونس: ۵)۔ گویا متبعین محمدؐ مذہبی طور پر اس بات کے مکلف بنائے گئے کہ وہ شمس و قمر کی اس گردش سے اپنے تقویم عمل کی ترتیب میں مدد لیں۔ اس پس منظر میں نماز پنجگانہ

کے اوقات کی تحدید، سمت قبلہ کا تعین اور صوم رمضان کے
لیے قمری کلینڈر کی ترتیب، یہ ایسے عملی اور فوری مسائل تھے
جنہوں نے مسلمانوں کو فی الفور مشاہدہ کائنات کی طرف
متوجہ کیا۔

وحدت قبلہ کا تقاضا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی بھی
خطۂ ارضی میں رہتے ہوں پنج وقتہ نمازوں میں اپنا رخ کعبہ
مشرفہ کی طرف کریں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دور دراز علاقوں سے
تعین قبلہ کی گتھی کیسے سلجھائی جائے؟ ابتدائی ایام میں کبھی
ستاروں کی مدد سے سمت قبلہ کے تعین کی کوشش کی گئی تو کبھی
طلوع آفتاب سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہوئی۔ بعض
علمائے فلکیات بڑے دقیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ
کعبہ کو مرکز مان کر مختلف بلاد و امصار کو بارہ جغرافیائی خانوں
میں تقسیم کیا جاسکتا ہے^۵ لیکن یہ سارے تخمینے قطعیت کے
احساس سے خالی تھے۔ مسلمان جب فقہی اختلاف کے



الخوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلة کا ایک صفحہ

گرداب میں پھنس گئے تو اختلاف قبلہ نے ایک مسلسل نزاع کی حیثیت اختیار کر لی۔ کوئی کہتا کہ رسول اللہ جب مکہ سے
مدینہ آئے تھے تو انھوں نے جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی اسی سنت پر اسپین اور وسط ایشیا کے ابتدائی مسلمانوں
نے بھی عمل کیا تھا سو ہمیں چاہئے کہ تعین قبلہ کی موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے دور دراز علاقوں میں ہم جنوب کی طرف
رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ کوئی اس موقف کو خلاف عقل بتاتا کہ جب رسول اللہ نے مدینہ میں جنوب کی طرف رخ
کر کے نماز پڑھی تھی تب مکہ واقع تھا جنوب میں واقع تھا سو اس سنت کو تعین قبلہ کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ کوئی کہتا کہ حج
کے لیے کارواں جس سمت کو جاتے ہیں اسے ہی سمت قبلہ سمجھا جانا چاہئے، تو کوئی کہتا کہ ان علاقوں کی پرانی مسجدیں جس
رخ پر بنی ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں، تو بعض اس خیال کی پر زور حمایت کرتے کہ علوم فلکیات کے ماہرین نے جو
تحقیقات کی ہیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روایتی اور غیر روایتی فہم کے ٹکراؤ نے ایک ہی مسجد
میں دو قبلوں کی طرح ڈال دی۔ صورت حال کی اس نزاکت نے علمائے فلکیات کو اس مسئلہ کا قطعی حل نکالنے پر مجبور
کیا۔ غور و فکر کا سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب تحدید الاماکن نے ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے اس مسئلہ کو فیصلہ کر دیا۔ اس نے Spherical Trigonometry کی مدد سے افغانستان کے ایک شہر سے تعین قبلہ کی
کامیاب کوشش کی^۶ اور پھر ان اصولوں پر کسی بھی جگہ سے سمت قبلہ کا تعین دشوار نہ رہا۔

عہد رسولؐ میں جب حضرت بلالؓ کو اذان کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی تو اس کی وجہ ان کی آواز کی بلند آہنگی اور لہجہ کی وجد آفرینی تھی۔ بعد کے دنوں میں بالخصوص دور دراز کے بلاد و امصار میں مؤذن کے تقرر کے لیے یہ بھی دیکھا جانے لگا کہ وہ اوقات نماز کا صحیح فہم رکھتا ہو، اسے گردشِ قمر کے مختلف منازل کا علم ہوتا کہ وہ رات کی تاریکی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ رفتہ رفتہ یہ مؤذن اپنے کارِ منصبی میں اس حد تک ترقی کر گئے کہ انھوں نے اوقات کے تعین کے لیے فلکیاتی آلات ایجاد کر ڈالے۔ علمِ التقویم پر کتابیں تصنیف کیں اور مختلف شہروں کے لیے الگ الگ اوقاتِ صلوٰۃ کی جدولیں تیار کر ڈالیں۔ سمتِ قبلہ کے تعین اور تحدید اوقاتِ صلوٰۃ کی ضرورتوں نے علمِ المیقات کے نام سے ایک نئی فلکیاتی سائنس کو جنم دیا۔ آج ہماری مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کا جو چارٹ ماضی کی علامت کے طور پر لٹکا دکھائی دیتا ہے اس کی جڑیں اسی علمِ المیقات میں پائی جاتی ہیں۔ تب ایٹوک گھڑیوں کا رواج نہ تھا اور تحدید وقت انتہائی پیچیدہ علم تھا جس میں ذرا سی بے احتیاطی حساب کتاب کے سارے گوشوارے الٹ کر رکھ دیتی تھی۔ اگر فلکیات بنیادی دینی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمان اس کام کو فرض عین کی حیثیت سے انجام نہ دیتے تو شاید جدید دنیا جیسی کہ وہ آج ہے وجود میں نہ آتی۔

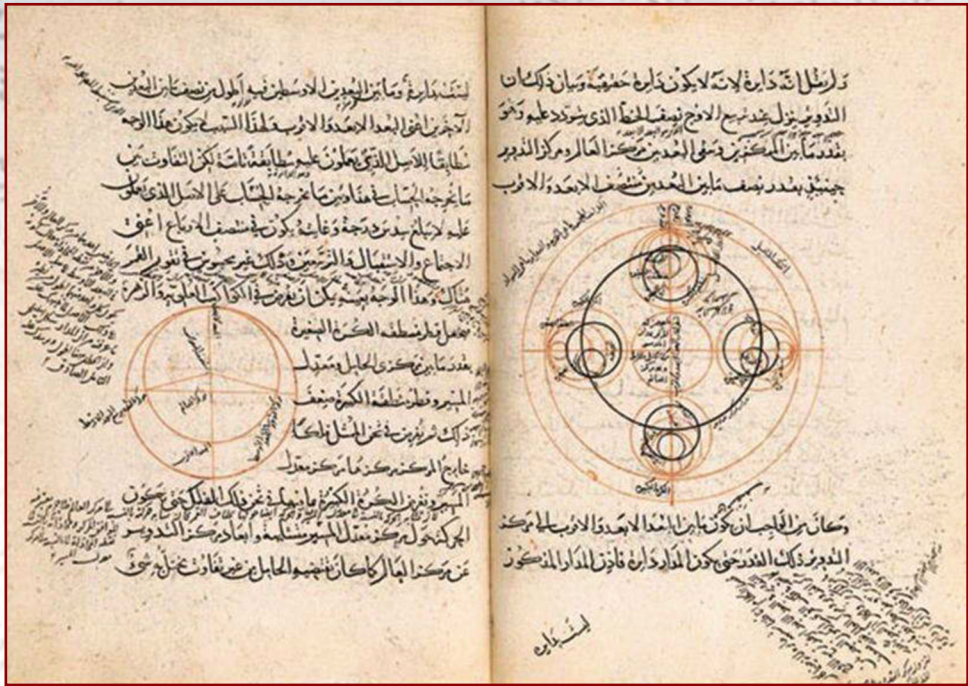
الخوارزمی نے جب اپنی مشہور زمانہ کتاب الجبر والمقابلہ تصنیف کی تو اس کے پیش نظر بھی ایک فرض عین کی ادائیگی تھی۔ آیت وراثت کے اطلاقی پہلو بعض اوقات بڑی دقیق پیچیدگیوں کو جنم دیتے جن کے حل کی مروجہ ریاضی میں تاب نہ تھی۔^{۱۲} کہا جاتا ہے کہ خود خلیفہ وقت نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تقسیم وراثت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کرے جس سے اس پیچیدہ مسئلہ کو منصفانہ انداز سے حل کیا جاسکے۔ خوارزمی نے اپنی اس کتاب کے ابتدائیے میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے وراثت کی تقسیم حتیٰ کہ زمینوں کی پیمائش، نہروں کی کھدائی اور اس قسم کے دیگر امور میں جیومیٹری تقویم کا کام آسان ہو جائے گا اور خدا اسے اس محنت کے عوض بہترین صلہ عطا کرے گا۔^{۱۳} کچھ اسی جذبے کا اظہار البتانی نے کتاب الزیج الصابی کے ابتدائیے میں کیا ہے۔ بقول البتانی: فلکیات کا علم تمام علوم میں ممتاز ہے جس سے روح کو بالیدگی، دل کو خوشی اور عقل کو جلال ملتی ہے، غور و فکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روز و شب کی گردش، شمس و قمر کے بدلتے مقامات اور ان کا گہن اور اپنے اپنے مدار میں ان کا مستقل محوسر رہنا انسانی ذہن کو خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، حکمت اور جلال و جبر کا احساس دلاتا ہے۔^{۱۴}

ظہور اسلام کے بعد جو لوگ تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا کے قیام کے لیے سرگرداں رہے وہ سب کے سب اس احساس سے سرشار تھے کہ وہ دراصل ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ مذہبی عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں تقویٰ شعاری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ یہ صورت حال آخر آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) جس نے ابن سینا کے القانون فی الطب کا تنقیدی محاکمہ لکھا اور جس کی

دورانِ خون کی بعض دریافتوں نے دنیائے طب کو انقلاب انگیز تبدیلی سے دوچار کیا، وہ فقہ شافعی کے اساطین میں سے تھے۔ اسی طرح نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) جن کا Tusi-Couple (الصغيرة والكبيرة) بطیموسی نظریات کے رد میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور جس نے آنے والے دنوں میں ایک متبادل نظام کائنات کے تخیل کا راستہ ہموار کیا، ان کا شمار اپنے عہد کے کبار اسمعیلی علماء میں ہوتا تھا۔^۱ کچھ یہی حال ان کے شاگرد رشید قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ہے، جو مراغہ کی رصدگاہ سے وابستہ رہے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ طوسی کے تذکرہ پر شریح لکھیں بلکہ اس فن پر بعض طبع زاد کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ شیرازی ان تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مقامی عدالتوں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔ یہاں تک کہ ان کے قلم سے جامع اصول الحدیث، شرح السنة اور فتح المنان فی تفسیر القرآن جیسی وقیع کتابیں بھی نکلیں۔ نظام الدین نیشاپوری (متوفی ۱۳۲۸ء) جو اپنی سائنسی تالیف شرح التذکرہ اور شرح المجسطی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں وہ بیک وقت غرائب القرآن و رغائب الفرقان کے مصنف بھی ہیں۔ ابن شاطر جن کی تحریروں سے مغرب میں نئے نظام کائنات کی بحث شروع ہوئی اور جس کے سرفقے سے کوپرنکس کو مغرب میں جدید دنیا کا بانی مبنی سمجھا گیا ان کی بابت تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موقیت کے عہدے پر مامور تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے التباس فکری اور آزدخیالی کا چرچا ہوتا رہا ہے جس میں ابن رشد کا نام سر فہرست ہے وہ بھی اشبیلیہ اور قرطبہ میں عہدہ قضاۃ سے وابستہ تھے۔ گویا ظہور اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک تحریک تسخیر و اکتشاف بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی جس کی کمان اہل مذاہب کے ہاتھوں میں تھی۔ اپنے تمام تر التباس فکری کے باوجود جس سے مسلم فکر کے دھارے ابتدائی صدیوں میں مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھے اکتشافی علوم کی دینی حیثیت مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر آخر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب و نظر میں کسی نامحسوس انقلاب انگیز تبدیلی کے لیے فضا ہموار ہو رہی ہو۔ ان عوامل کا تفصیلی محاکمہ تو ہم اگلے باب میں کریں گے۔ البتہ یہاں چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

عبدالملک کی سیاسی اصلاحات

عبدالملک کے عہد میں جب اسلامی ریاست ایک عرب امپائر کی صورت میں مشکل ہو رہی تھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے آنے والے دنوں میں ہمارے تہذیبی سفر پر فکری التباسات کی ایک دھند قائم کر دی۔ عبدالملک خود اپنے عہد میں گو کہ نزاعی حکمران رہے اور ایک طویل عرصہ تک سرزمین حجاز میں ان کی حکمرانی قائم نہ ہو سکی جہاں ابن زبیر منصب خلافت پر متمکن تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں تاریخ کی کتابوں میں انھیں قبولیت عامل مل گئی۔ عبدالملک نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جو مختلف اقدامات کئے اس میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ انھوں نے پہلی بار اپنے انتظامی دفاتر



ناصر الدین طوسی کی تذکرہ فی علم الهيئة

اور حساب کتاب کے گوشواروں کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کیے گئے۔ اس طرح گویا آنے والے دنوں میں عرب بیوروکریسی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس عہد میں ایک دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ بازنطینی حکمران ^{جسٹینیئن ثانی}، جو تثلیث کا پرزور مبلغ تھا اور جسے یہ بات گراں گزرتی تھی کہ مسلم ریاست اپنے سرکاری خطوط کی پیشانی پر قل ہو اللہ احد لکھے اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے موقف پر اصرار جاری رکھا تو وہ سکون پر رسول اللہ کے سلسلے میں ایسے الفاظ کندہ کرادے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد عبدالملک تک سونے اور چاندی کے سکے یا تو بازنطینی ٹکسال کے ڈھلے ہوتے تھے یا پھر ساسانی ریاست کے باقیات کے طور پر ان کی تصدیق شدہ مہروں کے سبب معتبر سمجھے جاتے تھے۔ روزمرہ کا لین دین ان ہی سکون کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ بازنطینی دھمکی نے عبدالملک کو فوری اقدام پر آمادہ کیا اور یہ بات طے پائی کہ مسلم ریاست اب اپنی ٹکسال کا اہتمام خود کرے گی۔ عربوں کے لیے یہ میدان خاصا نیا تھا۔ خالد بن یزید جو لکھمی سے دلچسپی کے لیے معروف تھے نہ مشاورت کے لیے طلب کیے گئے اور پھر اس فن پر باقاعدہ مہارت کے لیے جدوجہد شروع ہو گئی۔ یہ دو عوامل ایسے تھے جنہوں نے اجنبی مآخذ سے فنی کتب کے ترجموں کی راہ ہموار کر دی۔

مسلم ریاست کے لیے نیکسال کا قیام اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تجربہ تھا سو یہ عین فطری تھا کہ وہ اس بابت مروجہ فنی معلومات کے مجموع اور تحلیل و تجزیہ کا اہتمام کرتی۔ دوسری طرف دیوان محصولات کو عربی قالب مل جانے سے نئے عرب ملازمین کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ نظام مالیات و محصولات کی تہذیب و تنظیم کے سلسلے میں اس فن کی مروجہ کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کروائیں۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں میں جو کچھ علمی یا فنی سرمایہ موجود تھا اس کے ترجمے کی ضرورت کا احساس تیز تر ہوتا گیا۔ مسلمانوں کا ابتداء سے ہی یہ رویہ تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کو تاراج کرنے کے بجائے ان کے انتظامی ڈھانچے میں اصلاح کو پسند کرتے اور بسا اوقات مقامی گورنروں اور عاملوں کو بشرط وفاداری اپنے عہدوں پر برقرار رکھتے۔ یہ احساس عام تھا کہ فکر و فن کسی قوم کی اجارہ داری نہیں یہ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے سو اسے قبول کرنے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ الحکمۃ ضالۃ المومنین کی اس فضا میں اجنبی مآخذ سے ترجموں کو بنظر استحسان دیکھے جانے کا وافر فکری جواز موجود تھا۔ اگر ہمارے مترجمین صرف ترجمے پر اکتفا کرتے تو اکتساب و استفادے کی ایک صحت مندر روایت قائم ہونے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔ پھر وہ کتابیں جن کی تصنیف پر پانچ سات صدیوں کا عرصہ گزرا تھا اور جن کی علمی غلطیاں ہر خاص و عام پر واضح تھیں انھیں باسانی ازکار رفتہ سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مترجمین نے اہل یونان کی جن فنی کتابوں کے ترجمے کیے انھیں مروجہ معلومات کی روشنی میں تصحیح و تجدید کا سزاوار بھی قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ازکار رفتہ کتابوں کا اپنا اصل مقام متعین نہ ہو سکا اور انھیں علم و فن کے لازوال مآخذ کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس قبیل کی ایک بہترین مثال المجسطی کا وہ ترجمہ ہے جو جاب بن مطر کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ مترجم نے یہاں صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے علم کی حد تک بطلموس کی اس کتاب کو جدید اور مستند معلومات سے مزین کرنے کی بھی کوشش کی۔ فنی کتابوں کی جدید کاری نے اہل یونان کی علمی عظمت کا طلسم قائم کرنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ پھر آگے چل کر عباسی بغداد میں جب تحریک ترجمہ نے ایک علمی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ہر قسم کا رطب و یابس ترجمے کی میز پر آ گیا جن میں فلسفہ و فلکیات کی کتابیں بھی تھیں تو عام قاری کے لیے یہ خاصا مشکل ہو گیا کہ ان فرسودہ علوم کے دفتر سے کارآمد خیالات کو الگ کرے۔ اہل یونان کی کن مسلمہ باتوں کو صحیح مان لے اور کن باتوں کو گمراہ کن قرار دے۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر نے مسلم ذہن کو خاصے عرصے تک فکری تشنیت سے دوچار کیے رکھا۔ رد و قبول اور تحلیل و تجزیہ میں کئی صدیاں ضائع ہو گئیں۔ فلکیاتی اور سائنسی التباسات یونانی سے تو انھیں نجات بھی مل گئی البتہ تفسیر و تاویل کے منہج میں کلامی ذہن کی کارفرمائیوں سے آج بھی مسلم فکر جاں بلب ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کا محاکمہ تو اگلے باب میں آئے گا یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عہد اموی اور عباسی میں تقریباً تین سو برسوں تک مترجمین کے ہاتھوں جو کچھ انجام پاتا رہا وہ صرف ترجمے کا سیدھا سا عمل نہ تھا جیسا کہ مغرب میں یہ خیال عام ہے کہ اہل یونان کے ترجموں سے مسلمانوں نے اپنی تہذیب کا چراغ روشن کیا^{۱۲} اور پھر جب یہ روشنی یورپ کو منتقل ہو گئی تو مشرق میں علم و حکمت کا آفتاب

غروب ہو گیا۔ ہمارے خیال میں تحریک ترجمہ ہماری فکری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو زبردست فکری بحران اور ذہنی تشقت سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسا انوکھا علمی معرکہ ہے جس میں فاتح اور مفتوح کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر کو کبھی بھی قبولیت نامہ حاصل نہیں ہو سکا۔ ترجمے کی روایت ابھی پوری طرح مستحکم بھی نہ ہو پائی تھی کہ مسلم علماء کے قلم سے یونانی مفکرین کی کتابوں پر شبہات وارد کئے جانے لگے یہاں تک کہ جلد ہی کتب شکوک کی ایک نئی روایت قائم ہو گئی۔ مثال کے طور پر ابوبکر ذکریا الرازی نے کتاب الشکوک علی جالینوس مرتب کی اور ابن الہیثم نے الشکوک علی بطليموس لکھی۔^{۳۱} اس قبیل کی ایک اور کتاب الاستدراک علی بطليموس ہے جس کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ کسی اندلسی مصنف کی تصنیف ہے۔^{۳۲} ابوعبید الجرجانی (متوفی ۱۰۷۰ء) نے بطليموس کے تصور الفلک المعدل المیسر



برجنی کی شرح التذکرہ کا ایک صفحہ

(Equant) کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔^{۳۳} گویا ہند، یونان اور فارس کی کتابوں سے ترجمہ ہو کر جو کچھ آیا تھا اسے من و عن قبول کرنے کے بجائے تحلیل و تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابوالبرکات البغدادی (متوفی ۱۰۲۳ء) اور فخر الدین الرازی (متوفی ۱۲۰۹ء) جیسے متکلمین اگر ارسطو کے سخت ناقد رہے۔^{۳۴} تو ابوبکر ذکریا الرازی اور البیرونی جیسے سائنسدانوں نے بھی ارسطو کے تصور تخلیق کائنات اور نظریہ تغیر و تبدل کو کبھی بھی لائق اعتناء نہ سمجھا۔ بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ابوالفتح عبدالرحمن الخازنی کی تصنیف کتاب میزان الحکمة نے نہ صرف یہ کہ ارسطاطالیسی نظریہ کائنات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی بلکہ پہلی بار دنیا کے سامنے مرکز کش ثقل کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے آنے والی نسلوں کے لیے سائنسی فتوحات کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن ان علمی فتوحات کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ اہل

یونان کی علمی عظمت کے طلسم سے نکلنے میں مسلمانوں کی کئی صدیاں ضائع ہو گئیں اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان ابتدائی صدیوں میں جب مسلم اہل فکر اہل یونان کی کتابوں سے اشتغال کرتے رہے اور یہ کتابیں اپنی تمام تر فنی فرسودگی اور ازکار رفتہ معلومات کے باوجود علمی مناقشے کا حوالہ بنی رہیں قرآنی دائرہ فکر میں کسی راست اکتشافی تحریک کا ڈول نہ ڈالا جاسکا۔ لہذا نزول قرآن کے سبب سپردہ نفوس کی جو خواب آسا اکتشافی دنیا وجود میں آنا چاہئے تھی، چشم فلک اس کا نظارہ دیکھنے سے محروم رہ گئی۔

یونانی طلسم علمی کو چاک کرنے میں مسلم اہل فکر پر کیا گزری اور کس طرح وہ صدیوں ذہنی نشنت سے دو چار رہے اس کا کسی قدر اندازہ ابن الہیثم کے اس تنقیدی لب ولجہ سے ہوتا ہے جو اس نے المجسطی اور کتاب المنثورات پر سخت احتجاج کرتے ہوئے درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”اسے (بطلمیوس کو) یا تو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ جن مفروضات پر اپنے کلیہ کی بنیاد رکھ رہا ہے وہ ایک امر محال ہے یا وہ اس بات سے قطعی ناواقف تھا۔ اگر وہ امر محال جان کر بھی اس خیال کا قائل تھا تو یقیناً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا علم خام تھا اور اس کے تصورات و مفروضات سب گمراہ کن تھے جس کے لیے اسے یقیناً امور و الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر اس نے ان مفروضات کو اسرار و عواقب کے نتائج کا اندازہ لگانے کے باوجود اختیار کیا جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس لیے کہ اس کے پاس اس مسئلہ کا کوئی دوسرا بہتر حل موجود نہ تھا اور اس نے دانستاً اپنی غلطیوں سے صرف نظر کیا تو یقیناً وہ دوسری غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ پہلی بات تو ان مفروضات کو اختیار کرنے کے سبب جس کا ناممکن العمل ہونا واضح تھا اور دوسری بار اس غلطی سے صرف نظر کرنے کے سبب کہ وہ دانستاً ایک غلطی کر رہا ہے۔۔۔ اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سیاروں کی حرکت کے صحیح زاویے موجود ہیں جن میں باہم نہ کوئی تضاد ہے اور نہ ہی اس پر امر محال کا گمان ہوتا ہے لیکن یہ بطلمیوس کے مقرر کردہ خطوط سے یکسر مختلف ہے۔ بطلمیوس پر اس کی حقیقت واضح نہیں ہو سکی تھی اور نہ ہی اسے اس مسئلہ کا ادراک حاصل تھا۔“^۲

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف اہل یونان کے فلکیاتی تصورات کا بعید عن القیاس ہونا پہلی نسل کے مترجمین پر بھی واضح ہو گیا تھا لیکن تحریک ترجمہ نے دانش یونانی کا کچھ ایسا جلال و دبذبہ قائم کر رکھا تھا کہ ان تصورات کو فی الفور کالعدم قرار دینا آسان نہ تھا۔ ثنائی ان کی فرسودگی واضح ہونے کے باوجود علمی گفتگو کی بزم ان ہی قدماء کے حوالے سے سجائی جاتی رہی ورنہ اہل فن کا ایک خاصا بڑا حلقہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اوج شمس (Solar Apogee) کے تعین کے دوسرے بہتر طریقے بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ فصول کی بنیاد پر بعض اہل فن نے مامون کے عہد میں ذبیح الممتحن کی ترتیب کے ذریعے واضح کیا^۳ لیکن ان تمام ترجمین علمی نقائص کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اپنے مشاہدے کے برخلاف یہ کہتے نہ تھکتے کہ اگر بطلمیوس، جالینوس یا ارسطو کی کتابوں میں یوں لکھا ہے تو حقیقت یہی ہوگی۔ گویا معاشرے کا ایک غالب حصہ



خلیفہ ابن ابی الحسان کی کتاب الکافی فی الکحل
(تیرہویں صدی) کا ایک صفحہ جس میں دماغ اور آنکھوں
کے باہمی تعلق پر کلام کیا گیا ہے۔

ایک طرح کی دانشورانہ احساس کمتری کا شکار تھا اور یہ کچھ وہی صورتِ حال تھی جسے کانٹ کی اصطلاح مستعار میں self-imposed immaturity کہنا چاہئے۔ مدینۃ الحکمة نے ازکار رفتہ تڑجوں کی جو بزم سجائی تھی اس کے مقابلے میں، صاف محسوس ہوتا تھا، کہ خدا کی نازل کردہ کتاب الحکمة کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہو۔ خود اعتمادی اور تخلیقی فکر کا آبشار خشک ہو گیا ہو۔ ایسی صورتحال میں ابن ابیہشم کی یہ جھنجھلاہٹ برحق تھی:

”بطلمیوس نے پانچ سیاروں کا جو خیالی نظام وضع کیا ہے وہ ایک لغو اور مہمل بات ہے، اس کا مہمل ہونا خود اس پر بھی واضح تھا لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سیاروں کی حرکت اپنے اصل مدار پر قائم ہے اور یہ کسی عالم خیال میں نہیں بلکہ عملی دنیا میں ہو رہا ہے لیکن بطلمیوس اس صورت حال کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہا۔“^{۲۹}

اپنے عہد کے دوسرے مفکرین کے مقابلے میں ابن ابیہشم کو اس بات کا کہیں شدت سے احساس تھا کہ بطلمیوسی فلکیات فی نفسہ بے اصل اور غیر علمی بنیادوں پر قائم ہے جسے خیر باد کہے بغیر ایک علمی اور سائنسی منہج کا قیام ممکن نہیں۔ ابوجعفر البطر جی، جنھوں نے بالآخر بطلمیوسی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی انھیں بھی اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ یونانی تراجم کی ہیئت کس طرح صدیوں خالصتاً قرآنی دائرہ فکر میں ایک علمی تحریک کے امکانی نمونہ کا راستہ روک کر بیٹھ گئی۔ بقول بطر جی بطلمیوس کا قائم کردہ ماڈل رصدی وحسی مشاہدے سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ اُس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی بنیاد تو ہم پر ہے حقیقت پر نہیں۔^{۳۰}

سنت اللہ بنام دانش یونانی

دانش یونانی کی مسلسل مزاحمت اور تحریک ترجمہ کی پیدا کردہ مسلسل بلند ہوتی لے کے باوجود نزول و جی پر کوئی دو ڈھائی سو سال کا عرصہ بھی نہ گزر رہا ہوگا کہ مسلمانوں نے تمام مروجہ علوم کا احاطہ کر لیا۔ انسانی تہذیب کی اب تک کی پیش رفت تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آئی گئی۔ اہل یونان کے علمی ہیئت و جلال کے باوجود مسلم دانشوری کی زیریں لہریں اپنا کام کرتی رہیں۔ ابتدائی صدیوں کا مسلم ذہن جس پر حکمت بالغہؑ کی چھاپ اب بھی بڑی نمایاں تھی اس کائنات کو ایک منطقی اور مربوط نظام سے تعبیر کرتا تھا۔ اسے اس بات کا گہرا شعور تھا کہ شمس و قمر کی گردش، قوموں کا عروج و زوال اور کائنات میں

جہدِ پیہم کے لامتناہی سلسلے مربوط اور منظم قوانین کی رہین منت ہیں۔ خدا نے ہر چیز کے تغیر و تبدل، عروج و زوال اور اس کے خواص و تناسب کا ایک قانون طے کر دیا ہے سو اہل تسخیر کے لیے لازم ہے کہ وہ ان قوانین فطرت کا نہ صرف یہ کہ درک حاصل کریں بلکہ اسے کمال احتیاط کے ساتھ برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہوں۔ فطرت کے یہ قوانین اور عروج و زوال کے یہ مسلمات غیر جانبدار اور غیر مبدل ہیں۔ دنیا کی جو قوم بھی خدا کے ان قوانین سے خود کو ہم آہنگ کر لے گی، رازِ کائنات اس پر منکشف ہوگا، تسخیر و انکشاف کی دنیا اس پر وا ہوگی، سیاست و قیادت کا منصب اس کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ خدا کی یہ سنت، جسے قوانین فطرت کہیے، کسی شخص، قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہیں کہ {وَلَنْ يَجْعَلَ لِسَنَةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا}۔

سنت اللہ پر گہرا یقین اور حکمت بالغہ کی شناساوری فکری تشقت کی ان صدیوں میں بھی مسلمانوں کو مسلسل سِرِّ کائنات کی بے نقابی پر ہمیز کرتی رہی، محمد رسول اللہ نے اپنے متبعین کو کتاب کی تعلیم کے ساتھ حکمت سے بھی متصف کیا تھا: {وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ}۔ آپؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں ایک ایسے عقلی دائرہ فکری تشکیل کی جو انسان کو مکمل ذہنی بلوغ کے ساتھ کائنات کے مشاہدے اور اس کی تسخیر و انکشاف پر آمادہ کر سکے۔ حکمت قرآن سے باہر نہیں بلکہ خود ”تزکیہ ربانی“ کا پیدا کردہ وحی آسمانی روئے تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر سلیم القلبی کے ساتھ وحی ربانی کا مطالعہ کرے گا وہ حکمت کی نعمت سے متصف ہوگا اور پھر جب یہ صاحب حکمت کتاب و کائنات پر نظر ڈالے گا تو کتاب کی بہترین فہم اور کائنات کے سِرِّ الاسرار اس پر منکشف ہوتے جائیں گے۔ سنت اللہ کی اس تفہیم اور حکمت بالغہ کے اسی شعور نے مسلم اہل فکر کو اس ایقان سے سرشار کیا کہ علم و انکشاف ایک بے کنار سمندر ہے ”انسان کو چاہیے کہ وہ تمام کائنات کے اسرار منکشف کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اس عالم سے ماوراء جو اسرار ہیں ان سب کو منکشف کرنے کی صلاحیت اسے عطا کی گئی ہے“۔^{۳۲}

کتاب و حکمت سے مملو وحی آمیز عقلی رویے نے ایک نئے منہج علمی کو جنم دیا جس کی بنیاد قیاس مع الفارق استخراج یا توہمات کے بجائے مشاہدے اور تصدیقی تجربے پر رکھی گئی۔ قال الافلاطون یا قال البطلیموس پر انحصار کے بجائے نئے مسلم ذہن نے جو علمی منہج اختیار کیا اس کی ایک جھلک البیرونی کے اس اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے:

”میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان پر واجب ہے، کہ وہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرے یعنی اس فن میں جو لوگ اس سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے اجتہادات کو قبول کرے۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے سوچھے اسے اپنے بعد آنے والے متاخرین کے لیے بطور ایک یادداشت، محفوظ کر جائے۔“^{۳۳}

عقل و مشاہدہ اور تفکر و تدبیر کے اس نئے استخراجی (empirical) منہج علمی^{۳۴} نے انسانی تہذیب کو ایک نئے غلغلہ اور ایک بالکل ہی نئی جہت سے آشنا کیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کتاب کائنات یکسر مطالعہ کے لیے کھول دی گئی ہو اور

الشرق والحقاق في طريق علي بن الحسين عليهما السلام والنجاة
من عورهم من تعظيمهم السوء بهم العيون في حجة القرباء بعد الظلم
من عيبه للشرق وباع الخصال من حجة القرباء **وقد سوي القوي**
الذي يرضى للسوي مكنى الله به الحسين الكرم من شدة ولاءه ولما له الشرف
مكونا الايام في يوم اربعه والسني فخط السوء بولج الخلفاء حياهم قوما
وذا الخلفاء في وقت الاستبداد والظلم الكرام واولا الذين طردوا
والعظماء لم يرضوا بظلمهم في حجة القرباء واولا السوء في حجة
قرباء القوي واسأل الله عن درجهم واول من يرضى بظلمهم في حجة
قرباء القوي واولا ايضا بطي الخلفاء والارواح السوء في الخلفاء
والعظماء في الخلفاء وبه العيون في حجة القرباء

من قبله كسوف الشمس في البلاد من اجل ان بعض النجوم
 موشى بعب جهمه فانهم اقبلوا به معه وعادوا على حالهم بعد
 ولاه طلال في اول اوجس من انوار من سماء القبر اقبل على
 في البلاد حسب لتمام الفروع لمرا الفجر يجرى في بعضه اقبل
 وفيه جفعا الصغرى في بلاد وادي عفران في اول الفجر
 صرح جميع ليس يوجد الانواع **كسوف الشمس** ما مد
 القمر في اول الفجر والوعان على ما في بعض عفران
 من بعض طلال في اول الفجر في بعضه في بعض
 تروا وفي اعتداله من قبل ان سقرنا على طلال في بعض
 من قبله من اول الفجر وسر ما اكلنا في بلاد عفران
 الفجر في الشمس من يوم الفجر انما سقرنا من سقر
فعل **عقل** في البلاد بلغة دنيا لاجل احد علماء دنيا
 في كسوف القمر في بعضه في بلاد وادي عفران
 من جهة لتمام الفجر في اول الفجر من بلاد وادي عفران
 بعبره وليس ما عفران في بلاد وادي عفران في بلاد وادي عفران
 حاوفاة في البلاد لا فخر في امان من الفجر في بلاد وادي عفران
 ولا عفران في بلاد وادي عفران في بلاد وادي عفران
 قلب كذا في بلاد وادي عفران في بلاد وادي عفران
 دنيا في بلاد وادي عفران في بلاد وادي عفران

امکانات کی ایک نئی دنیا وجود میں آنے کو بے تاب ہو۔ جب انسان اس یقینِ وثاق سے سرشار ہو کہ دنیا دراصل ریاضیاتی قانون پر قائم ہے اور یہ کہ عالم موجودات کی عددی توجیہ عین ممکن ہے، جیسا کہ جابر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خواص اشیاء کی عددی تاویل اگر مہیا کی جاسکے تو اشیائے عالم کے لیے ریاضیاتی حتمیت کے میزان کا اصول قائم کرنا ممکن ہو سکے گا یا اس کا یہ دعویٰ کہ یہ اصول اشیاء اور اس کی داخلی ہم آہنگی کے ایک نظام کی وضاحت کرتا ہے، ہر شے میں اس کا ظہور ہے اور یہی دنیا کا مجرد اساسی مفہوم^{۳۵} بھی۔ تو یہ سمجھئے کہ اس نے آنے والی نسلوں پر اسباب و علل کی اس دنیا کا اساسی راز منکشف کر دیا۔ اس نئے منہج علمی کی بنیاد طلب حق پر رکھی گئی تھی۔ مسلم علماء اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ قرآن مجید کی دعوت اکتشاف نے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ بقول ابن الہیثم حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں لہذا ”طالب حق وہ نہیں جو منتقدین کی کتابوں کا محض قاری ہو اور ان پر حسن ظن میں اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ بہہ جائے بلکہ طالب حق وہ ہے جو ان کے بارے میں اپنے ظن پر بھی شک کرے۔۔۔ اگر وہ اس روش کو اختیار کر سکے تو حقائق اس پر منکشف ہو سکیں گے اور منتقدین کے یہاں جو امکان کی کوتاہی یا اشتباہ رہ گیا ہو گا اسے نظر آجائے گا“^{۳۶} اس نئے منہج علمی نے

جس کی اشاعت نزول وحی کے بعد مختلف بلاد و امصار میں مسلسل ہوتی رہی تھی ہمارے تہذیبی سفر کے بے لاگ تجربے اور نوع انسانی کے کارواں کو نئے خطوط پر منظم کرنے میں کلیدی رول انجام دیا۔ انسانی تہذیب جو تاریخ کی عظیم ترک تازیوں، باجروت بادشاہوں کے تذکروں، عاد و ثمود کے عبرت انگیز قصوں، داؤد و سلیمان کے جاہ و حشم اور حکمت لقمان کے مسرت آگیز تذکروں کے باوجود کتاب فطرت سے ناواقفیت کے سبب بے سمتی کا شکار تھی، دیکھتے دیکھتے تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا سجانے لگی۔

نیاز ہن: نئے امکانات

یہ نیا منہج علمی جس کی بنیاد ظن و تخمین کے بجائے مشاہدے اور تجربے پر رکھی گئی تھی آنے والے دنوں میں رصد گاہوں کے قیام پر منہج ہوا۔ کوئی ہزار برسوں تک، جب تک عالم اسلام میں غور و فکر کی روایت زندہ رہی، مختلف بلاد و امصار میں نئی رصد گاہیں قائم ہوتی رہیں۔ جب مجتہدین نگاہیں ایک بار آسمان کی طرف اٹھ گئیں تو اس قسم کے سوالات فطری تھے: یہ فضا، یہ فلک اور آسمان کا یہ لاجوردی رنگ، اس کی حقیقت کیا ہے؟^{۲۸} ہوائیں کیوں چلتی ہیں اور یہ کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی کیوں ہوتی ہیں؟ الکنڈی نے ان سوالوں کے جو جواب فراہم کئے وہ بیحد وہی تھے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے George Hadley اور Immanuel Kant سے منسوب کئے جاتے ہیں۔^{۲۹} انریزی نے بادلوں اور بخارات کی بلندی کی پیمائش کی اور سہل الکوہی نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ شہابیہ کن کن فاصلوں پر ہیں۔ ابتدائی چند صدیوں میں تسخیر و اکتشاف کی اس تحریک نے عالم اسلام کو مسلسل ایک طرب انگیز کیفیت سے دوچار کئے رکھا۔ صورت حال کی صحیح تصویر کشی کے لیے لازم ہے کہ ہم اجمالی بیان کے بجائے تحریک اکتشاف کے چند غلغلہ انگیز لمحات کا قدرے تفصیلی تذکرہ کریں۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ عالم اسلام میں پہلی باقاعدہ رصد گاہ عہد مامون میں شمشاسیہ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیوں پر قائم کی گئی تھی۔ اس منہج علمی کا پہلا شمر جو مسلمانوں کی جھولی میں گرا وہ Arch of the Mediterranean یعنی خط استوا کے طول کی پیمائش تھی۔ علمائے اکتشاف نے تدریجاً اور رقبہ کے مابین ایک درجے کے طول کی پیمائش کی اور اس کے ذریعے خط استوا کا طول چالیس ہزار دو سو تریسین (40,253) کلومیٹر دریافت کر لیا جو غیر معمولی طور پر محتاط پیمائش کی ایک کامیاب مثال تھی۔ پھر کیا تھا جلد ہی الزیج الممتحن کے نام سے علوم فلکیات کی جدولیں تیار ہونے لگیں اور اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ دنیا جیسی کہ وہ ہے اسے ٹھوس علمی بنیادوں پر ایک نقشے کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔

آنے والے دنوں میں البیرونی کی شہرہ آفاق تصنیف کتاب تحدید الاماکن نے محیط ارضی کی پیمائش کا ایک اور طریقہ دریافت کر لیا۔ البیرونی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر Mural Quadrant نامی آلے کا استعمال کیا جائے تو اس قسم



قطب الدین شیرازی کی تحفۃ الشاہیہ فی الہیۃ کا ایک ورق

کی پیمائش کے لیے صحرانوردی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آج Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام Tychonicus پڑ گیا ہے۔^{۴۰} البیرونی کی اس تنقید سے قطع نظر عہد مامون کے اصحاب اکتشاف کے سامنے ایک ایسی دنیا کی تحدید کا کام تھا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ایک ایسے خریطہ عالم (World Map) کی ترتیم کا خیال جس میں کائنات اپنے حدود اربعہ، سیاروں، زمین، سمندر، آباد اور غیر آباد علاقے، شہر اور بن اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔^{۴۱} بلاشبہ اپنی نوعیت کا ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی میں الادریسی نے سسلی کے عیسائی شہنشاہ روجر کی فرمائش پر خریطہ عالم کی ترتیب کے ساتھ نزہۃ المشتاق فی اختراق الافاق (Tabula Rogeriana) تالیف کی جس میں اس وقت کی دنیا کی تقریباً تمام ہی معلومات کا احاطہ کر لیا گیا۔

خریطہ عالم کے وجود میں آنے اور اس فن میں اکتشافی مسلمانوں کی مہارت کے سبب دنیا کے بارے میں قصے کہانیوں اور پراسرار خیالی واقعات کی دھند اب بڑی حد تک چھٹ گئی۔ اب تک ساسانی، فارسی اور ہندی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ بھی لکھا تھا اسے ذاتی مشاہدے اور تجربات سے پرکھا گیا۔^{۴۲} ۲۴ مئی ۹۹۷ء کو ابوالوفا (متوفی ۹۹۸ء) اور ابوریحان البیرونی نے پہلی بار کاتھ اور بغداد کے مابین طول البلد کی پیمائش کی۔ آمودریا (Oxus river) کے کنارے

البیرونی اگر ایک طرف چاند گرہن کا انتظار کر رہے تھے تو دوسری طرف بغداد میں ابوالوفا اس جستجو میں مصروف تھے کہ اسی چاند گرہن کے ذریعے ان دو جگہوں کے مابین طول البلد (Longitude) کی پیمائش کیسے کی جائے۔ طول البلد کی صحیح ترین پیمائش نے ان حضرات کو حیرت آمیز مسرت سے دوچار کر دیا۔ پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ارض و سموات کی ماہیت انسانی جیلۂ ادراک کا اس حد تک حصہ بن سکتی ہے کہ وہ محض گردش شمس و قمر کے ذریعے اس کے طول و عرض سے واقف ہو سکتا ہے۔ البیرونی اور ابوالوفا کی اس مشترکہ دریافت نے انسانی فکر میں ایک پلچل کی سی کیفیت پیدا کر دی۔^{۳۳}

گیارہویں صدی کے اواخر میں عمر خیام کی قیادت میں شہر اصفہان میں روز و شب کی باریک بین پیمائش کا کام از سر نو شروع ہوا۔ محتمس نگاہیں ایک بار پھر آسمانوں کے تعاقب میں لگ گئیں۔ بالآخر برہسبارس کی محنت شاقہ کے بعد سال ۱۰۷۹ء میں عمر خیام نے ایک سال کی طوالت 365.242198 دنوں پر محمول کی جو جدید تحقیق سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔ فی زمانہ الیکٹرونک آلات اور ایٹومک گھڑیوں کے عہد میں سال کی طوالت 365.242190 سمجھی جاتی ہے۔ عمر خیام جو مغرب میں رباعیات کے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں انھوں نے پہلی بار اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا کہ زمین اپنے مدار پر گردش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر خیام نے جس مجمع عام میں شمع اور گلوب کی مدد سے زمین کی گردش کے ریاضیاتی ثبوت فراہم کئے اس میں ابو حامد الغزالی، جنھیں بعد میں حجت الاسلام کی حیثیت حاصل ہو گئی، بہ نفس موجود تھے۔

بطلموس کے مفروضہ الفلک المعدل للمسیور (Equant) کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ابن الہیثم نے اس تصور کو نہ صرف یہ کہ پوری شدت سے رد کیا بلکہ اس نے پہلی بار سیاروں کی حرکت کے سلسلے میں ایک قابل قبول توجیہ پیش کی۔^{۳۴} ابن الہیثم کا موقف تھا کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہو سکتی کہ کائنات میں کوئی ایسا دائرہ موجود ہو جو اپنے مدار پر اس کے مرکز سے گزرے بغیر مسلسل گردش میں رہے۔ البیرونی نے بطلموس کی مشہور زمانہ کتاب کے بارے میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس قبیل کی تحریروں کا علم ہیئت یا فلکیات سے کوئی تعلق نہیں۔^{۳۵} بطلموسی نظام کے اس مبینہ نقص نے علمائے فلکیات کو حقائق کا پتہ لگانے اور ایک نئے کائناتی ماڈل کی تشکیل پر آمادہ کیا۔ مغرب اقصیٰ میں البطر جی (متوفی ۱۲۰۰ء) ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) اور جابر بن الفح (متوفی ۱۲۰۰ء) ایک نئے ماڈل کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہی بطلموسی نظام شک کے دائرے میں آ گیا تھا۔ البتہ متبادل نظام کی تشکیل مراغہ کے اہل علم کے لیے مقدر تھی۔ نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۳ء) نے اس سمت ایک اہم پیش رفت کی۔ انھوں نے زنج الائنائی کے نام سے ایک ہمہ گیر جدول مرتب کیا جس کی بنیاد Trigonometry پر رکھی اور جس کے سبب آسمانوں کی سمت اور مسافت کی پیمائش ممکن ہو گئی۔ طوسی نے الصغیرۃ والکبیرۃ (Tusi-Couple) کا تصور دے کر آنے والی تحقیق کو المعدل المسیر کے گرداب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلادیا۔ طوسی نے اپنی کتاب تحریر المجسطی

۳۵

رمل، نجوم، کہانت اور سفلی علوم پر ہی کیا موقوف لکھی جیسا محبوب مشغلہ بھی شک کے دائرے میں آ گیا۔ لکھی کے بجائے علم کیمیا کی بنیاد پڑی۔ جابر جو اس علم کے بانی اور امام کی حیثیت رکھتا ہے اس نے تمام کیمیائی مظاہر کو قانون الاسباب کا تابع بتایا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ انسانوں کے لیے ان اسباب کا پتہ لگانا عین ممکن ہے۔ بقول جابر، اشیاء کے خواص اس کے اندر پائے جانے والے مختلف اجزاء کے تناسب پر منحصر ہیں۔ آگے چل کر جابر کا یہ کلیہ میزان Law of Proportions کے نام سے مشہور ہوا۔ المیزان نظام کائنات کے ایک ایسے مجرد اساسی اصول کی حیثیت سے سامنے آیا جس کی بنیاد پر پوری کائنات کی ریاضیاتی توجیہ کے امکانات روشن ہو گئے۔^{۱۷} جابر، جسے آج بھی بابائے کیمیا کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، نے تجربات کو علم کیمیا کی بنیاد قرار دیا۔ اس نے پہلی بار معدنیات سے تیزاب تیار کیے مثلاً گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) شورے کا تیزاب (نائٹرک ایسڈ) اور نمک کا تیزاب (ہائڈروکلورک ایسڈ) جس میں فولاد جیسی دھات کو پگھلا دینے کی صلاحیت پائی گئی۔ تیزاب کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اس نے الکل کی ایجاد کی۔ اس کے علاوہ بعض تیزاب کے مجموعے سے ماء الملوک (aqua regia) تیار کیا جس میں سونا اور پلٹینم جیسی دھاتیں بھی تحلیل ہونے لگیں۔ علم کیمیا کی ان ایجادات نے آگے چل کر مصنوعی کھاد، پلاسٹک کے سامان بلکہ کہہ لیجئے کہ سینتھک اشیاء کی دنیا بنانے میں کلیدی رول انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جابر کو کائنات کی کیمیائی اور ریاضیاتی تفہیم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ستر کائنات کی بے نقابی کے ذریعے مصنوعی مخلوق بلکہ مصنوعی انسان بنانے کا خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ جابر کی پرواز تخیل عہد جدید کی کلوننگ کی تحقیقات پر اثر انداز ہوئی ہو یا نہیں البتہ مغرب میں بعض ادبی شہہ پاروں پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں^{۱۸}

نویں صدی عیسوی تک جب بصریات پر علمائے قدیم مثلاً اقلیدس [Euclid] (۲۹۵ ق م) اور جالینوس [Galen] (۱۲۹ء-۲۰۰ء) کا غلبہ تھا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اشیاء کے دکھائی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی طرف جانے کے سبب ہے۔ رازی (متوفی ۳۰۰ھ) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ غالباً وہ پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی مناسبت سے پھیلتی یا سکڑتی ہے۔ ابن الہیثم، جسے قانون انعطاف (Law of Refraction) اور قانون انعکاس (Law of Reflection) کی دریافت کا اعزاز حاصل ہے، نے اس بات کے تجرباتی شواہد فراہم کیے کہ کسی شئی کو دیکھنے کے لیے روشنی آنکھوں سے نہیں نکلتی بلکہ باہر سے آنکھوں کے اندر داخل ہوتی ہے جس سے آنکھ کے اندر اس شئی کی تصویر مرتب ہو جاتی ہے اور ہم اس طرح دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ بصارت کے اصولوں کی توجیہ نے نہ صرف یہ کہ آنکھ کی اصل ساخت سے ہمیں متعارف کرایا بلکہ آگے چل کر بصریات کے قوانین مرتب کرنے اور دور بین کی ایجاد میں بھی مدد و معاون ثابت ہوئے۔ ابن الہیثم کے ایک دوسرے ہم عصر البیرونی نے روشنی کی رفتار کو آواز سے تیز تر ثابت کر دکھایا اور خود ابن الہیثم نے دنیا کو پہلی بار اس حقیقت سے باخبر کیا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اسے بے زماں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مستقبل میں بصریات میں ہونے والی



الزہراوی اپنے چند طلباء کے ساتھ دوران علاج تعلیم دیتے ہوئے۔ (ماخذ: ویلکم لائبریری لندن)

تحقیقات ابن الہیثم کے ان ہی اساسی نظریات کی مرہون منت رہیں جنہیں آج بھی بابائے بصریات یا بابائے طبیعیات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں کمال الدین الفارسی نے قوس قزح کے راز کو منکشف کر دیا۔ اس نے بتایا کہ قوس قزح کا بننا دراصل فضا میں موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دو بار ٹوٹنے کے سبب ہے۔ شعاع کے ٹوٹنے میں زاویوں کا جو اختلاف ہوتا ہے اس سے مختلف رنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ قوس قزح کی یہ بعینہ وہی توجیہ ہے جس کی دریافت کا سہرا سترہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ (René Descartes) کے سر باندھا جاتا ہے۔

پہلی صدی ہجری تک اہل یونان کی طرح مسلمانوں میں بھی ابجدی نمبروں کے استعمال کا رواج تھا۔ کائنات کی ریاضیاتی تفہیم و تعبیر کے لیے اعداد و شمار کا روایتی طریقہ جب ناکافی معلوم ہونے لگا تو مسلمانوں نے ہندوستانی طریقہ شماریات سے استفادے کی کوشش کی۔ الکندی نے ہندوستانی نمبروں کو رواج دینے کی کوشش کی لیکن اسے بعض عملی پیچیدگیوں کے سبب مقبولیت نہ مل سکی۔ الخوارزمی وہ پہلا شخص ہے جس نے صفر سے نو تک کے ہندسوں میں بڑی سے بڑی گنتی لکھنے اور اس میں مختلف قسم کے حسابی تصرفات کے امکانات کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ الخوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ سے ریاضی کی دنیا میں غیر معمولی انقلاب آگیا۔ معاملہ وراثت کی تقسیم کا ہو یا زمین کی پیمائش کا، الجبر والمقابلہ نے انتہائی پیچیدہ حساب و کتاب کو آسان اور عام فہم بنادیا۔ آنے والے دنوں میں خوارزمی کی یہ کتاب دنیائے ریاضی میں اتنی اہمیت اختیار



علم نباتات پر پندرہویں صدی کا ایک عربی مخطوطہ جس کے لاطینی چرے جلد ہی عام ہو گئے۔

کر گئی کہ اسے ریاضی کی ایک مستقل شاخ، الجبرا کی حیثیت دے دی گئی اور خود اس کا نام الخوارزمی جب یورپ پہنچا تو اس سے الگورتھم منسوب ہو گیا جس کے دم سے آج بھی دنیا کے کمپیوٹنگ کی رونق قائم ہے۔
الخوارزمی کی کتاب نے ہندی اعداد اور صفر کو جس طرح متعارف کرایا اس سے یقیناً حساب و کتاب میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ اس کتاب کو ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ احمد الاقلد یسی (متوفی ۹۸۰ء) نے کتاب الفصول فی الحساب الہندی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے عدد سے بھی آگے بڑھ کر کسر اشاریہ (Decimal Fraction) کے جوڑ گٹھاؤ کا طریقہ ایجاد کیا۔ جسے مغرب میں کئی صدیوں تک Simon Stevin (۱۵۷۸-۱۶۲۰ء) کا کارنامہ سمجھا جاتا رہا۔ تیسری صدی ہجری میں ریاضی کے علم نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ تفریقی مساواتوں (Differential Equations) اور تکملی احصاء (Integral Calculus) کا استعمال عام ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی مساوات (Equations) ہیں جنہیں (J. Keppler) نے سترہویں صدی کے اوائل میں حرکات سیارگان کے حساب پر منطبق کیا۔^{۳۵}
ریاضی کی بنیاد جب ایک بار اس ايقان پر رکھ دی گئی کہ اس مہیب پر اسرار کائنات میں ہر شے ایک انتہائی باریک بین ریاضیاتی نظام پر قائم ہے تو پھر ریاضی کو سر کائنات کی نقاب کشائی کے عمل میں بنیادی کلاہ بلکہ راس الکلیہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مسلم علماء نے اعلیٰ درجے کے ریاضیاتی مسائل پر اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں صرف کیں۔ اب تک جو کچھ ناقابل تصور سمجھا جاتا تھا عملی طور پر ظہور پذیر ہونے لگا۔ مثال کے طور پر المابانی کو لیجئے جس نے ریاضی کی تاریخ میں پہلی بار تیسرے درجے کی جبری مساوات وضع کی جسے وہ خود تو حل نہ کر سکا البتہ ابو جعفر الخازن نے اسے حل کر دکھایا۔ پانچویں صدی ہجری میں عمر خیام نے پہلی بار تیسرے درجے کی مساواتوں کا اصول اور حل پیش کیا البتہ وہ اس تشنگی کے ساتھ دنیا سے گیا کہ مطلق عددی حل (Absolute Numerical Solution) اس کی پہنچ سے دور رہ گیا ہے، کیا عجب مستقبل میں کوئی اور اسے ممکن کر دکھائے۔ کہا جاتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں شرف الدین طوسی نے عددی حل معلوم کر لیا تھا۔^{۳۶} بات یہیں ختم

نہیں ہو گئی آنے والے دنوں میں بیجی المغربی (متوفی ۱۲۸۳ھ) نے roots of the number کی دریافت کا طریقہ ایجاد کر ڈالا۔ اور پھر کوئی ڈیڑھ سو سال کے بعد غیاث الدین جمشید الکاشی (متوفی ۱۳۲۹ھ) نے دائرے کے circumference اور radius کے تناسب کا پتہ لگا کر دنیائے ریاضی میں ہلچل پیا کر دی۔^{۵۵}

عقل و اکتشاف کی اس غلغلہ انگیز تحریک نے قدیم طبی تصورات کو بھی تقلیب فکر و نظر سے دو چار کر دیا۔ ابتداً اہل یونان کے طبی علوم کو حرف آخر کی حیثیت حاصل تھی۔ جالینوسی نظام طب، جو اصلاً بقراط (Hippocrates) کا خوشہ چین تھا، اس مفروضے پر قائم تھا کہ تندرستی دراصل جسم میں پائے جانے والے چار مختلف قسم کے مائع مادوں کے تناسب اور توازن سے عبارت ہے۔ ان چار رقیق مادوں کو جسے جالینوسی طب کی اصطلاح میں humor کہا جاتا تھا دراصل عناصر رابعہ ہوا، پانی، آگ اور زمین کا عکاس سمجھا جاتا تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عیسائی دنیا چرچ کے زیر اثر اس خیال کی قائل تھی کہ بیماری دراصل ایک طرح کا خدائی انتقام ہے۔ فنی التباسات اور مذہبی توہمات کے اس ماحول میں مسلم علمائے اکتشاف نے دنیائے طب میں بھی تجربات و مشاہدات کی قندیل روشن کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بغداد میں مرکزی ہاسپٹل کا منصوبہ سامنے آیا تو اہل فن نے سب سے پہلے گوشت کے ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر آویزاں کر دیئے پھر اس جگہ کو ہاسپٹل کے لیے منتخب کیا جہاں گوشت کے خراب ہونے کا عمل نسبتاً سست تھا۔ اس واقعہ سے کم سے کم اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں بھی جب طب کی مروجہ کتابوں کا تحلیل و تجزیہ جاری تھا اور اس فن کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، مسلم اطباء پر جرثومے کی دنیا بے نقاب ہو چکی تھی یا کم از کم وہ جرثومے کی مضرت رسانی سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں علمائے فقہ کو اس حقیقت پر قائل کرنے میں بسا اوقات دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔^{۵۶}

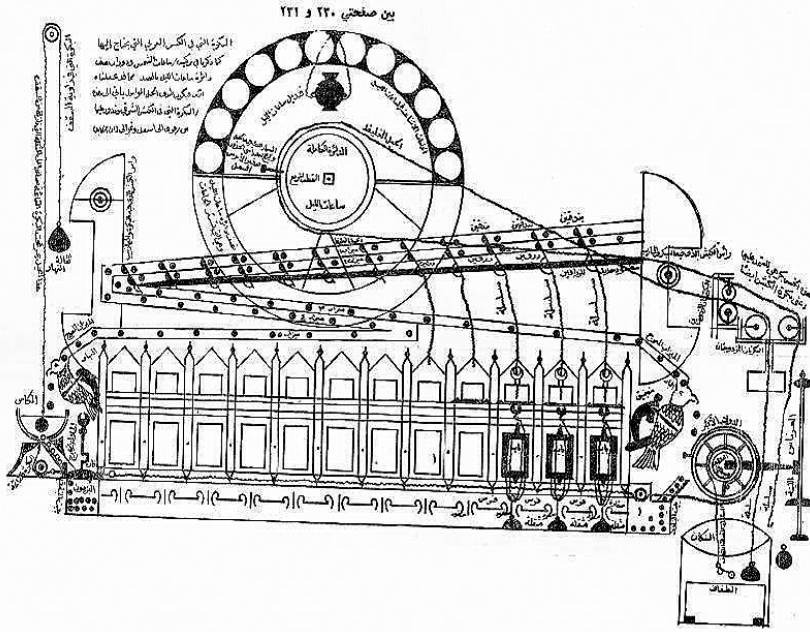
نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ہی حنین بن اسحاق، جو جالینوس کا پہلا عربی مترجم ہے، نے جالینوس کی بعض صریح غلطیوں کا اندازہ کر لیا تھا لیکن اسے معمولی ترمیم سے آگے ہمت نہ ہوئی۔ جالینوس کی Anatomy کا تو یہ حال تھا کہ اس کے بعض نقائص اہل فن پر واضح ہو گئے تھے لیکن کسی کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سے انکار کرتا۔ عام رویہ یہ تھا کہ اگر جالینوس نے یوں لکھا ہے تو یقیناً یہ سچ ہوگا خواہ مشاہدہ اس کی تردید کرتا ہو۔ البتہ رازی [Rhazes] (پ ۸۶۵) وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب شکوک لکھ کر جالینوس کے بت کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا۔^{۵۷} رازی نے پہلی بار چیچک (small pox) اور خسرہ (Measles) کے فرق کو واضح کیا اور اس فن پر چند بنیادی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ اس نے جملہ امراض اور اس کے علاج پر مشتمل الحاوی کے نام سے تین جلدوں میں دنیائے طب کا ایک ایسا خزینہ مرتب کر ڈالا جس کی مثال اس سے پہلے انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چوتھی صدی ہجری میں ابوالحسن الطبری نے خارش کا سبب اور اس کے جرثومے سے پہلی بار دنیا کو باخبر کیا۔^{۵۸} ابن سینا نے تپ دق کے متعدی ہونے کی بات کہی۔^{۵۹} اور اسی صدی میں ابوالقاسم الزہراوی نے دموی

امراض کا پتہ لگایا۔ پانچویں صدی میں عبدالملک بن زہر نے دنیا کو غلافِ قلب کے اورام (Pericarditis) سے آگاہ کیا۔
 الحاوی کی اشاعت کو ابھی ڈیڑھ صدی گزری ہوگی کہ ابن سینا نے اپنا نیا شہرہ آفاق مخزنِ طبّی القانون فی الطب
 شائع کر دیا۔ ابن سینا کے القانون نے صدیوں شرق و غرب میں اہل فن کی رہنمائی کی اور مغرب کی دانش گاہوں میں کوئی
 پانچ چھ سو سالوں تک اسے طب کی ام الکتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ ابن سینا کے ایک نو جوان معاصر ابوالقاسم الزہراوی
 [Abulcasis] (متوفی ۱۰۱۳ء) نے کتاب التصریف لمن عجز عن التألیف کے نام سے تیس جلدوں میں ایک ایسے
 مخزنِ طبّی کی تالیف کی جس میں دنیائے طب کا عطر کشید کر لیا گیا تھا۔ اس کتاب کی چھبیس جلدیں علم الادویہ سے متعلق تھیں
 جب کہ آخری جلد صرف سرجری کے لیے مختص کی گئی تھی۔ الزہراوی کا یہ کارنامہ چونکہ اندلس کی سرزمین پر انجام پایا تھا اس
 لیے مغربی دنیا پر اس کے اثرات فی الفور پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عملِ جراحی کے بعض پیچیدہ مسائل جن کے حل کا سہرا مغربی
 اہل فن کے سر باندھا جاتا ہے واضح طور پر الزہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔ مثلاً بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا
 طریقہ جسے سولہویں صدی کے فرانسیسی جراح Ambroise Paré کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے یا فنِ تولید میں جرمن طبیب
 Walcher (متوفی ۱۹۳۵ء) سے منسوب Walcher Position یا زخموں کی سلائی کے لیے Friedrich Trendelenburg
 (متوفی ۱۹۲۴ء) سے منسوب ٹرنڈلنبرگ طریقہ بی یہ تمام طریقے ابوالقاسم الزہراوی کے یہاں معروف تھے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں ابن سینا کے بعض طبی تصورات پر شکوک وارد کئے گئے۔ ابن النفیس (پ ۱۲۱۳ء) نے
 انسانی نبض کے سلسلے میں پرانے تصورات کی نہ صرف یہ کہ نفی کی بلکہ القانون کے مقابلے میں علم طب کی ایک نئی درسی
 کتاب تیار کی جس نے جلد ہی عالمِ اسلامی میں القانون فی طب کی جگہ لے لی۔ ابن النفیس نے اپنی تالیف کتاب
 شرح تشریح القانون میں جالینوس کے اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ قلب کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں خون
 جانے کے لیے بیچ میں کوئی سوراخ بنا ہوتا ہے۔ ابن النفیس نے دنیا کو اس حقیقت سے متعارف کرایا کہ قلب کے دائیں
 حصے سے بائیں حصے میں خون جانے کا کوئی اور راستہ پھیل چڑھے کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ ابن النفیس کی اس دریافت کوئی
 اصطلاح میں pulmonary transit کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو دورانِ خون کی دریافت کا سہرا جو ۱۶۲۸ء میں William
 Harvey کے سر باندھا گیا اس کا سہرا تیرہویں صدی عیسوی میں ابن النفیس سے جاملتا ہے۔

اکتشافی تمدن کا قیام

نئے مسلم دماغ نے تحقیق و اکتشاف کی ایک ایسی غلغلہ انگیز تحریک برپا کی جس نے زندگی کے تمام ہی گوشوں کو ایک
 تغلیبِ مسلسل سے دوچار کئے رکھا۔ کائنات کی یہ نئی تفہیم جس کے مطابق دنیا اہل فکر کے لیے دعوتِ شوق ٹھہری اور جہاں یہ
 احساسِ مسلسل عام ہوتا رہا کہ {ان فی اختلاف اللیل والنہار وما خلق اللہ فی السموات والارض لآیات لقوم



مسجد اموی دمشق میں رضوان الساعی کی مشہور زمانہ آبی گھڑی کا ڈائگرام

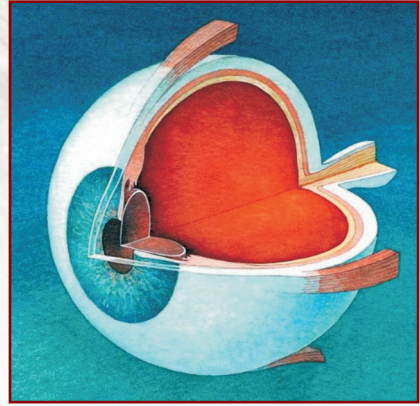
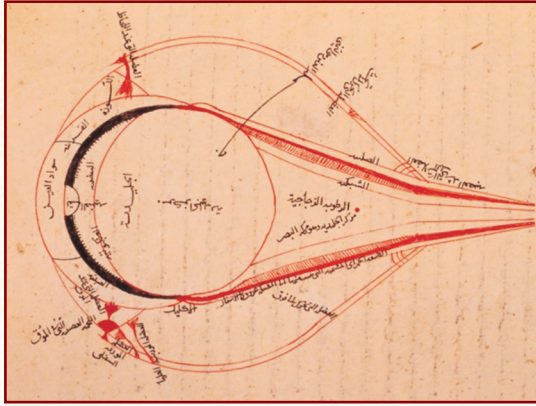
یتقون { ایک ایسی ثقافت کے قیام پر منتج ہوا جو ظن و تخمین کے بجائے مشاہدے اور یقین سے غذا حاصل کرتا۔ خدا کی اس مہیب پراسرار کائنات کا مشاہدہ، اس کی تخلیقی نشانیوں پر غور و فکر، سنت اللہ کے اسرار سے کسی قدر آگہی اور {سیروافی الارض} کی قرآنی دعوت نے مسلم ذہن کو ہر لمحہ اس احساس سے دوچار کئے رکھا گو یا تسخیر و اکتشاف کا یہ عمل ایک انبساط انگیز مگر کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہو کہ

آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

گذشتہ صفحات میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ استخراجی سے استقرائی منہج علمی کی تبدیلی نے کس طرح علمائے متقدمین کے مسلمات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ساسانی، ہندی، اور یونانی علوم جب تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر بار بار پرکھے گئے تو بڑے بڑے اساطین وقت کا اعتبار جاتا رہا۔ بطلمیوس ہوں یا جالینوس، ارسطو ہوں یا اقلیدس جن کے علمی و بدبے صدیوں سے تلاش حق کی راہ مسدود کر رکھی تھی، وہ اس نئے منہج علمی کی تاب نہ لا سکے۔ مشاہدے کی یہ لے مسلسل تیز ہوتی رہی یہاں تک کہ {سیروافی الارض} کی قرآنی دعوت نے بعض مہم جو جووانوں کو، خدا کی یہ دنیا جیسی کہ وہ ہے، اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر ہمبیز کیا۔ اس سلسلے میں ابن جبیر (متوفی ۱۰۲۱ء) اور ابن بطوطہ

(متوفی ۷۳۷ھ) کے نام آج بھی اساطیری اہمیت کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۳۲۵ء میں ابن بطوطہ جو اس وقت اکیس سال کا ایک نوجوان تھاجج کے سفر پر روانہ ہوا۔ چوبیس سال بعد جب گھر واپس آیا تو وہ عالم عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان، روس، افریقہ، چین، اور سماترا کی سیر کر چکا تھا۔ ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے سفر ناموں نے دنیائے شوق کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا۔ اس طرح مختلف اقوام و تہذیب کے بارے میں پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے شخص واحد کا مصدقہ تجربہ سامنے آیا۔ ابوالفدا (متوفی ۷۳۳ھ) نے پہلی بار اس امر کا انکشاف کیا کہ دنیائے شوق کے سفر میں جب مسافر ایک سمت سے دوسری سمت کا سفر کرتا ہے تو اسے دنوں کے گھٹنے بڑھنے اور کبھی اچانک وقت کے ٹھہر جانے کا احساس ہوتا ہے۔ یاقوت الحموی (متوفی ۷۲۹ھ) نے معجم البلدان لکھ کر دنیا کے تقریباً تمام ہی معروف شہروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور کہاں کیسے لوگ آباد ہیں، ایک ایسا جام جہاں نما فراہم کر دیا جہاں بیک نظر اقوام عالم کی تمام تر جلوہ نمایوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا تھا۔

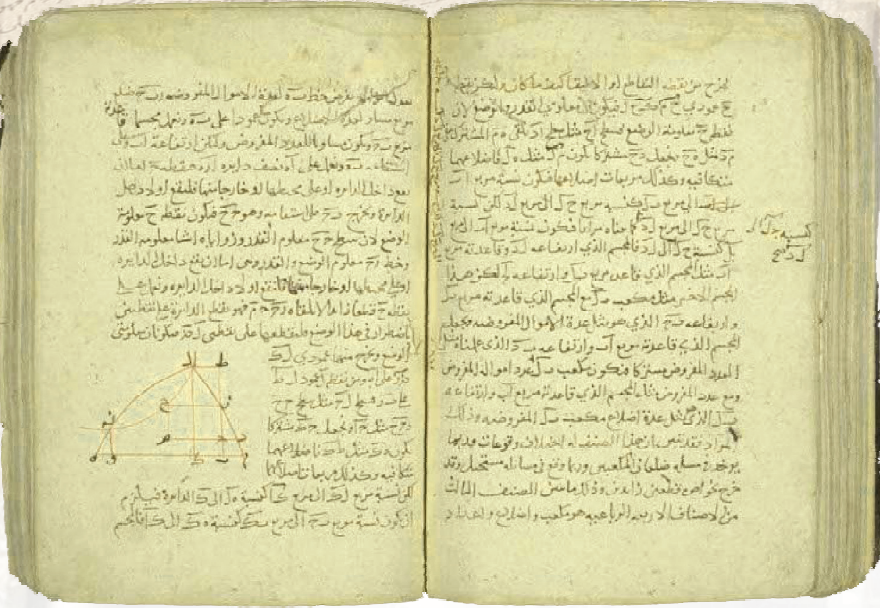
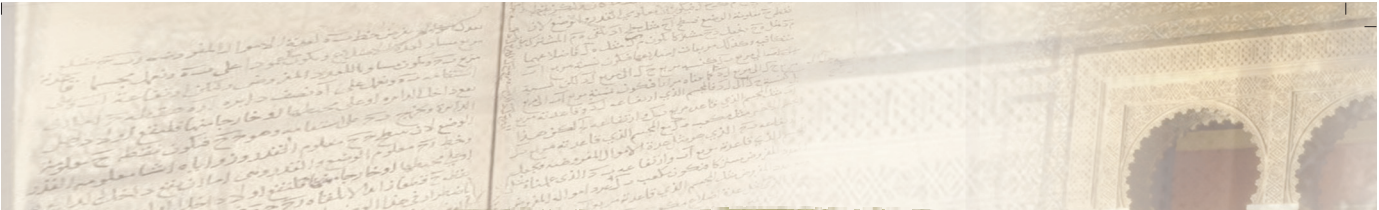
معاصر دنیا سے عملی آگہی، سفر کا شوق، مخازن علمی کی اشاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالم اسلام کی وسیع سرحدوں کے اندر، جس میں متمدن دنیا کا غالب حصہ شامل تھا، اکتساب و استفادے کی عمومی لہر نے انسانی تہذیب کو ایک ایسی تجربہ گاہ فراہم کر دی تھی جہاں بیک وقت مختلف خطوں کے علوم اور مختلف ثقافتوں کے حاصل کار کا نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر اہل اُندلس کی ذرائعی تکنیک نے، جہاں سال میں کئی فصلوں کا رواج تھا، اہل عراق کو ایک سے زیادہ فصل کی راہ دکھائی۔ اہل ایران جن کے یہاں نہروں کے ذریعے آبپاشی اور نشیبی زمینوں سے اوپر پانی پہنچانے کی روایتی تکنیک تھی، وہ اہل عراق و اہل شام کے کام آئی۔ مختلف قسم کے پھل ایک علاقہ سے دوسرے علاقوں میں متعارف ہوئے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک ذرائعی انقلاب نے پورے عالم اسلام کو اپنی انبساط انگیز آغوش میں لے لیا۔ عمومی خوشحالی کے اس ماحول نے، جس کا احساس آٹھویں صدی عیسوی سے ہونے لگا تھا اہل اکتشاف کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کیا۔ فرصت کے اس ماحول میں اہل فن نے بعض ایسی ایجادات بھی پیش کیں جن کا مقصد بظاہر تو عقل کو حیران کرنا تھا لیکن فی الاصل یہ اس خیال کی داعی تھیں کہ کائنات کے بعض قوانین کی بنیادی تفہیم سے ایک نئے عالم طلسم کا قیام ناممکن نہیں۔ بنوموسیٰ جو تاریخی مصادر میں ایک ماہر مشین ساز کی حیثیت سے متحرک نظر آتے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خود کار کھلونوں کی ایک دنیا آباد کر دی تھی۔ رنگ بدلنے والے فوارے، خود کار سریلی بانسریاں حتیٰ کہ چھوٹی سی روبوٹ لڑکی جو آپ کی خدمت میں چائے پیش کر سکے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں اسپین کے شہر طلیطلہ میں الزرقالی (Arzachel) نے ایک ایسی آبی گھڑی بنائی جو وقت بتانے کے ساتھ ساتھ چاند کی گردش سے بھی مطلع کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں تک یہ گھڑی طلیطلہ کے عجائبات میں شمار ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک ماہر فن نے اس کا راز جاننے کے لیے اسے کھول کر دیکھا اور پھر دوبارہ اسے اپنی اصل حالت پر قائم نہ کر سکا۔



تنقیح المناظر میں آنکھ کی ماہیت کا ڈائیگرام جو حیرت انگیز طور پر نئی تحقیقات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

نزول وحی کے پیدا کردہ اس عالم اکتشاف نے عام ذہنوں کو جس اعتماد سے آشنا کیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اُن علمی اور تجرباتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے جو مسلسل ان صدیوں میں مختلف بلا و امصار میں ہوتی رہیں۔ یہ احساس عام ہو چلا تھا کہ خدا کی اس کائنات میں جو انسانوں کے لیے تسخیر کی گئی ہے تو انین فطرت سے آگہی ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ بحر و بر کی تسخیر، خشکی و تری پر انسانوں کی چلت پھرت کے مناظر تو دنیا نے بہت دیکھے تھے، نویں صدی عیسوی کے شہر قرطبہ میں عباس بن فرناس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ہوائی سفر کا منصوبہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے اچانک جامع قرطبہ کے ایک بلند منارہ سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے پیراشوٹ جیسی کوئی چیز پہن رکھی تھی۔ اس تجربہ سے حوصلہ پا کر اس نے دوسری بار باز کی ساخت کا ایک لکڑی کا فریم بنایا۔ وقت مقررہ پر ایک جم غفیر اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ اس نے بلندی سے اڑاں بھری کوئی دس منٹ تک ہوا میں چکر لگانے کے بعد اس کا جہاز زمین میں آگرا، اس کی پشت مجروح ہو گئی۔ دوبارہ اس ستر سالہ بوڑھے کو مزید تجربے کا موقع نہ مل سکا۔

تحریک اکتشاف کے عمومی غلغلے نے صرف مسلم ذہن کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ غیر مسلم علماء و مفکرین بھی اس تحریک کا حصہ بن گئے۔ ابتدائی صدیوں میں جب مسلم ریاست کی سرحدیں مسلسل وسیع ہوتی جاتی تھیں عددی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں تھے۔ البتہ ان کے اکتشافی طرز فکر نے فکری اور علمی سطح پر پورے معاشرے کو اپنے دائرہ اثر میں سمولیا تھا۔ رنگ و نسل، زبان و زمان اور مذہب و ملت کے سارے امتیاز سے بالاتر ہو کر پورا معاشرہ اس تحریک میں شریک تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس عظیم الشان مہم کی قیادت اہل ایمان کے ہاتھوں میں تھی۔ تب متبعین محمدؐ اس یقین واثق کے حامل تھے کہ انھیں غیابِ پیغمبرؐ میں اقوامِ عالم کی سیادت یا {شہداء علی الناس} کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس لیے راز کائنات کی بے نقابی اور اس کی اطلاقی منصوبہ بندی ان کے ملی منشور کا حصہ ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس ہزار سالہ اکتشافی تحریک کے باوجود جس نے مغرب کے عہد تاریک کو روشنی بخشی اور آج بھی جس کی بنیادوں پر جدید سائنسی تہذیب کا چراغ روشن ہے،



عمر خیام (۱۰۴۸-۱۱۳۱ء) کے مقالہ فی الجبر والمقابلہ کا ایک ورق

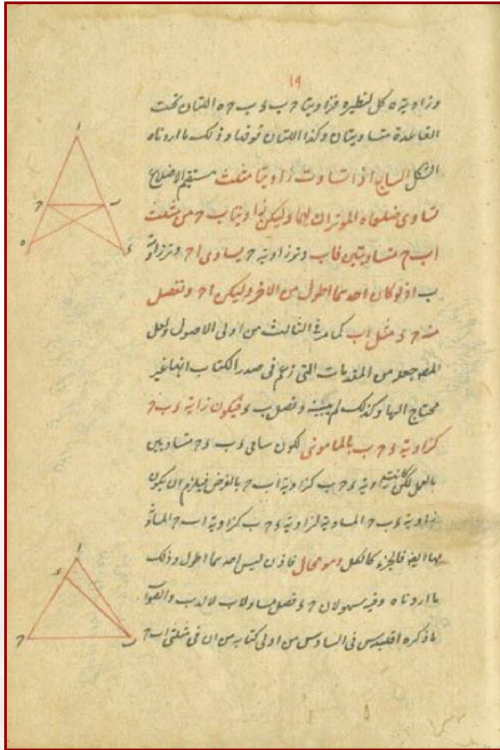
یہ کتبہ نہیں تھکتے کہ اسلام میں سائنس کے پینے کے امکانات معدوم ہیں تو وہ دراصل بدترین قسم کے تعصب اور سخت ناواقفیت کا شکار ہیں۔

گذشتہ صفحات میں ہم قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ عالم اسلامی میں ہر دور میں تحریک اکتشاف کی کمان جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ وحی ربانی کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے تفسیر و تاویل اور فقہ و کلام جیسے روایتی دینی علوم پر باضابطہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اہم اکتشافی کتابیں جو علوم اکتشاف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی اشاعت نے ہماری تہذیب کو انقلاب فکر و نظر سے دوچار کیا ہے ان کے ابتدائی صفحات اس بات پر گواہ ہیں کہ مصنف نے ان کتابوں کو خالص دینی جذبے سے تحریر کیا ہے جن پر وہ خدا سے بہترین اجر کے طالب رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس عمل کو اپنا فریضہ منہی نہ سمجھتے تو اس تحریک کے پیچھے عوامی تائید کا فقدان ہوتا۔ پھر نہ تو عباسی بغداد میں بیت الحکمہ کا علامتی ادارہ وجود میں آتا اور نہ ہی اتنے بڑے پیمانے پر تاریخ کے مختلف ادوار میں رصد گاہوں اور تجربہ گاہوں کی ریت قائم ہوتی۔ حتیٰ کہ فقہی التباسات کے اس عہد نمناک میں بھی جب کلامی فقہ کے مجادلوں سے امت کا وجود لہو لہان تھا، ایک فقہی گروہ دوسرے کا خون بہانا مباح سمجھتا، رصد گاہوں اور تجربہ گاہوں پر عوامی تادیب کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان علمی اور اکتشافی سرگرمیوں کو حکمران اپنے سیاسی جواز پر محمول کرتے جس کا ایک بین ثبوت خود عہد عباسی میں بیت الحکمہ کا قیام بھی ہے۔

ہمارے مورخین نے بیت الحکمة کے بیان کو غیر معمولی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ جہاں دمشق کی جامع اموی کی علمی سرگرمیاں بنو امیہ کے زوال کے سبب حاشیہ پر چلی گئیں وہیں دار الحکمة کے موسسین کی حکومت کا سلسلہ کوئی پانچ سو سالوں تک چلتا رہا جس کے اثرات تاریخ نگاری پر پڑنا فطری تھے۔ نزول وحی کے بعد تسخیر و اکتشاف کا جو عمومی غلغلہ بلند ہوا تھا اس نے مختلف بلاد و امصار میں رصد گاہوں، لائبریریوں اور علمی مجالس کا جال بچھا دیا تھا۔ عالم اسلام کا کوئی ایسا قابل ذکر شہر نہ تھا جہاں چوٹی کے علماء و مفکرین کا ایک قابل ذکر گروہ نہ پایا جاتا ہو۔ اہل فن کی اس کثرت تعداد کے سبب ہی یا قوت الحموی (۱۷۹ء تا ۱۲۲۹ء) کو مختلف سوانحی معاجم مثلاً معجم الادباء، معجم الشعراء اور اخبار الشعراء وغیرہ مرتب کرنے کی تحریک ملی۔

کہا جاتا ہے کہ دمشق میں اموی حکمرانوں نے جو پہلی باضابطہ لائبریری قائم کی اس میں اس عہد کا تمام علمی سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ طب، الکیمی اور اجنبی زبانوں میں مختلف علوم کے خطوطات ہر خاص و عام کے استفادے کے لیے مہیا کر دیئے گئے۔ آگے چل کر جب فاطمیوں نے مصر میں ایک نئی خلافت کی بنیاد رکھی تو ان کی اسکیم میں بھی لائبریریوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔

کہا جاتا ہے کہ فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں صرف علوم عہد قدیم سے متعلق کتابوں کے لیے چالیس کمرے مختص کئے گئے تھے۔^{۱۸} عوامی زندگی میں کتابوں نے کس قدر اہمیت اختیار کر لی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۲۳۴ء میں بغداد میں جب مدرسہ مستنصریہ کا قیام عمل میں آیا تو خلیفہ نے اپنے ذاتی کتب خانے سے اسے اسی ہزار کتابیں مرحمت فرمائیں۔ مسجد جسے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے لائبریری کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جہاں مختلف امور پر ہمہ دم علمی مناقشوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ دمشق، بغداد اور قاہرہ کے تذکروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ بڑی



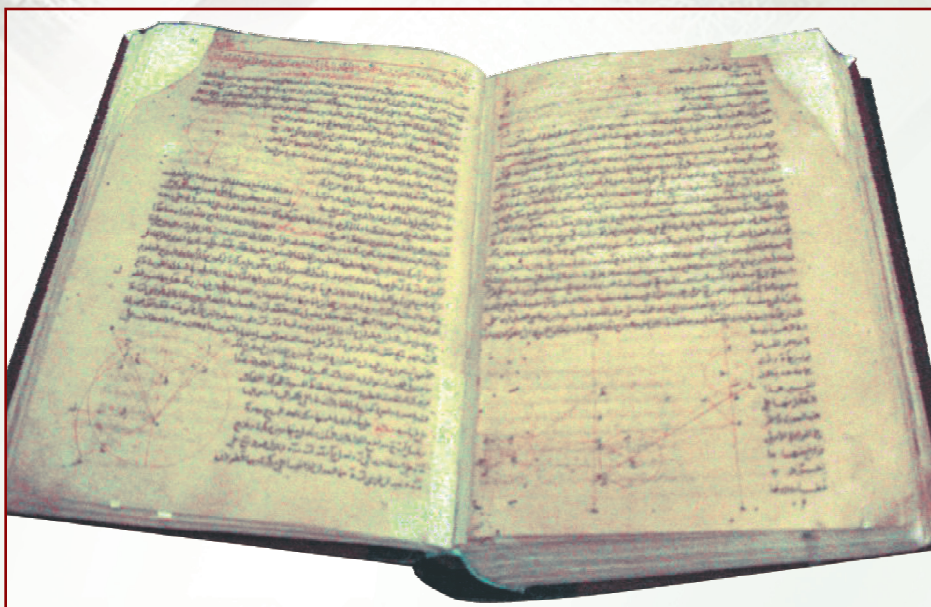
قاضی زادہ الرومی (۱۳۶۴-۱۴۳۶ء)
کی جیومیٹری کی کتاب کا ایک صفحہ

لابیریوں کی سہولت صرف دار الخلافہ یا بڑے شہروں تک محدود تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے شیراز میں ایک ایسی لابیری کا تذکرہ ملتا ہے جو تین سو ساٹھ کمروں پر مشتمل تھی اور جس کے ارد گرد نہروں اور باغات کا دلفریب سلسلہ قائم تھا۔^{۱۹} صرف مرو کے شہر میں، جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے، تیرہویں صدی عیسوی میں دس عظیم الشان لابیریاں تھیں۔ بغداد جو مدرسوں کا شہر سمجھا جاتا تھا اور جہاں اس وقت تیس مدرسے قائم تھے ہر مدرسے کی اپنی الگ لابیری ہوا کرتی تھی۔^{۲۰} کہا جاتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے مصر میں جب القاضی الفاضل نے ایک مدرسہ قائم کیا تو اس نے اس مدرسے کو خود اپنی طرف سے ایک لاکھ کتابوں کا عطیہ دیا۔^{۲۱} اس صورت حال کا موازنہ اگر اس وقت کی دوسری لابیریوں سے کیجئے تو اس لابیری کلچر کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیرس کی مشہور زمانہ سوبون یونیورسٹی کی لابیری میں چودہویں صدی عیسوی میں صرف دو ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں جبکہ وینٹیکن کی مرکزی لابیری پندرہویں صدی عیسوی میں کل دو ہزار دو سو ستاون (۲۲۵۷) کتب پر مشتمل تھی۔^{۲۲}

سماجی زندگی میں لابیریوں کو مسجد کے ساتھ مرکزی اہمیت مل جانے اور تعلیم و تعلم کی اس عمومی فضا کے قیام میں کاغذ کی صنعت نے اہم رول ادا کیا۔ ابتدائے اسلام میں چرمی اور اوراق یارقی الممنشور (Papyrus) کے استعمال کا رواج عام تھا جس کے سبب کتابیں خواص کے حلقے تک محدود تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد میں پہلی کاغذ کی فیکٹری قائم ہوئی۔^{۲۳} جلد ہی اس صنعت کو اتنا فروغ ہوا کہ بغداد کے بازار کاغذ فروشوں اور اسٹیشنری کے ساز و سامان سے بھر گئے۔^{۲۴} کہا جاتا ہے کہ بغداد میں صرف لکھنے پڑھنے کی اشیاء کے لیے ایک پورا بازار وجود میں آ گیا تھا جسے سوق الوزاقین کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کاغذ کی یہ عام دستیابی گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب تک علم و فن کی جو دنیا صرف خواص کے لیے محدود تھی اب اس کے دروازے عامۃ الناس پر وا کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصہ بحث

قرآنی دعوتِ تنخیر و اکتشاف نے علم کی جو عمومی تحریک پیدا کی تھی وہ فکری اور سماجی طور پر اس حد تک مسلم معاشرے کا حصہ بن گئی تھی کہ اس پر سیاسی انقلابات کے اثرات کم ہی پڑتے تھے۔ خلافتیں تاراج ہوتیں، حکمران تبدیل ہوتے لیکن علم و فن کی شمع تابندہ رہتی۔ خلافت راشدہ کا سیاسی سفر، سفر معکوس میں مبتلا، عباسی بغداد، فاطمی مصر اور اموی اسپین میں انتشار کا شکار ہوا لیکن مسلم ذہن کی تابانی، اجنبی علوم کی تنقیح و تنقید اور سرکائنات کی نقاب کشائی میں مشغول رہی کہ اب مسلم تہذیب نے 'صورتِ خورشید' جینے کا فن سیکھ لیا تھا۔ بغداد پر زوال آیا تو قرطبہ چمکنے لگا اور جب اسپین میں امویوں کا چراغ گل ہونے لگا تو دمشق، استنبول، تاشقند، سمرقند، بخارا، کابل، قاہرہ، دہلی اور نہ جانے کتنے شہر ہماری تہذیبی فتوحات کا علامہ بن گئے۔



البیرونی کی قانون المسعودی کی ایک جھلک

قرآن مجید کی دعوتِ فکر بالآخر سرکائنات کی بے نقابی پر منتج ہوئی۔ ابتداء میں تو مسلمانوں نے ساسانی، یونانی اور ہندی مآخذ سے ملنے والی دانشِ انسانی سے بھرپور اکتساب کی کوشش کی لیکن علم و حکمت کی اس تنگ دامانی کا جب انھیں اندازہ ہوا تو پھر وہ مشاہدے اور تجربے کی راہ پر چل نکلے۔ وہ علمی مفروضات جس کی صداقت تجربات و مشاہدات سے نہ ہوتی ہونا قابلِ اعتنا قرار پائے۔ بطلموسی نظام اور دانشِ یونانی جسے عیسائیت نے معتبر قرار دے رکھا تھا اور جو صدیوں سے انسانی فکر کی پیش قدمی میں مزاحم تھے بالآخر بڑی رد و کد اور تحقیق و جستجو کے بعد مسترد کر دیئے گئے۔ جس دن ابن الہیثم نے بطلموسی نظام کی صداقت پر اعتراض وارد کر دیا تھا تو بس سمجھ لیجئے کہ اسی دن جدید سائنس کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ آگے چل کر جب مراغہ کی رصدگاہوں میں منہک ماہرینِ فلکیات نے مشاہدے کو علم کائنات کی اساس قرار دے ڈالا اور جس کے نتیجے میں ابن شاطر کی تصنیف کتاب نہایۃ السؤل فی تنقیح الاصول وجود میں آئی تو علمائے فن اس اعتماد سے سرشار ہو گئے کہ انھوں نے مستقبل کی علمی اساس کا بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابن شاطر کا یہ کارنامہ کوئی ڈیڑھ سو سال بعد جب کوپرنکس کے حوالے سے مغرب میں عام ہوا اور بعد کی تحقیقات نے ان اساس پر ایک نئی دنیا تعمیر کر ڈالی تو کچھ تو تعصب اور کچھ بے خبری کے سبب مغرب اس خیال سے غافل رہا کہ سرکائنات کی بے نقابی کا سرا اس قرآنی

دائرہ فکر میں پایا جاتا ہے جس نے کائنات پر غور و فکر کو ایک مذہبی فریضے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ گو کہ ارسطو کی کتابوں کے تراجم نے مسلم ذہن کو وقتی طور پر منحصر میں ڈال دیا تھا۔ ایسا اس لیے کہ علوم کا یونانی تصور اولاً خاصاً محدود تھا۔ نیچرل فلاسفی جسے بسا اوقات فزکس کا نام بھی دیا جاتا تھا، کے علاوہ میٹافزکس اور میتھمیٹکس پر تمام علوم کا احاطہ ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف ارسطو طالیسی تصور کائنات میں دنیا کو ایک ازلی ابدی حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ خدا کے ساتھ ساتھ کائنات کے قدیم ہونے کا تصور قرآنی دائرہ فکر سے مغائر تھا۔ ابتداءً مسلم اہل فکر کے لیے ان خیالات سے مطابقت پیدا کرنا یا انھیں یکسر مسترد کرنا خاصاً دشوار ثابت ہوا۔ البتہ جب کائنات پر غور و فکر کے لیے عقلی اور سائنسی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں تو نہ صرف یہ کہ کائنات کے بارے میں یونانی تصورات پس پشت چلے گئے بلکہ علوم کی یونانی روایتی تقسیم اکتشافی عمل کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم نے جب کتاب المناظر لکھی یا البیرونی نے کتاب تحديد نهاية الأماکن تصنیف کی تو انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ علوم کی بالکل ہی نئی شاخوں کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس عہد کی تصنیفات پر ایک نگاہ ڈالنے تو حیرت ہوتی ہے کہ جن باتوں کے اب تک صرف عمومی اور سرسری تذکرے کو دانش کی معراج سمجھا جاتا تھا ان پر بہت قلیل عرصے میں باضابطہ تخصیصی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ کوئی کتاب علم الهندسہ لکھ رہا ہے تو کوئی کتاب الجبر والمقابلہ لکھنے میں مصروف ہے اور کسی کا شوق تحقیق اسے کتاب النجوم کی تصنیف پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مسلم اہل علم ارسطو سے خاصے متاثر رہے۔ البتہ عالم اسلام کے مجموعی ماحول پر قرآنی تصور کائنات اور مذہبی جذبہ شوق و تحقیق غالب رہا۔ اور اگر مامون کے اس خواب کے کو بھی اس پس منظر میں رکھئے جو اس نے ارسطو سے متعلق دیکھا تھا تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ ابتدائی ایام میں یونانی علوم و دانش کو بنیادی طور پر مسلم دائرہ فکر کے معاون کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔

بعض مفکرین اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ جدید سائنس خالصتاً مغرب کی ایجاد ہے۔^۸ وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام اپنی تمام تر علمی اور فکری ترقی کے باوجود جدید سائنس کے پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ ان حضرات کے خیال میں اسلام کی کچھ ساخت ہی ایسی ہے کہ وہاں غور و فکر اور مشاہدہ و ایجاد کی نیل منڈھے نہیں چڑھتی۔ زوال کی صدیوں میں مسلمانوں کے لیے اس قسم کی جلی کٹی باتیں اور فارق الحقائق الزامات کچھ نئے نہیں رہے ہیں۔ ان معترضین سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اولاً اگر قدامت یونان کی کتابیں عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہو کر ان تک نہ پہنچتیں تو کیا وہ (مفروضہ) جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتے؟ ثانیاً علمائے یونان کے عربی تراجم اس ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی تہذیب میں علم و حکمت کی بالیدگی کی خاصی گنجائش موجود رہی ہے۔ ثالثاً قدامت یونان کی کتابیں اگر ایک علمی سائنسی انقلاب کے لیے کافی تھیں تو پھر ان کتابوں نے، جب وہ اپنی اصل شکل میں رومی سلطنت کے علاقوں میں موجود تھیں، کوئی سائنسی انقلاب کیوں نہیں پیدا کیا؟ رابعاً آخر کیا وجہ تھی کہ ساسانی، رومی اور ہندی مآخذ



نجیب الدین محمد علی السمر قندی (متوفی ۱۲۲۲ء) کی الادویۃ المعروفة المستعملة کے ابتدائی صفحات

سے آنے والے علم و فن اپنی اصل سرزمینوں میں وہ نتائج نہ پیدا کر سکے لیکن جب قرآنی دائرہ فکر میں انسانی تہذیب کے اس علمی ورثے کو تحلیل و تجزیہ کے موضوع بنایا گیا تو ایک انقلاب آگیا کیفیت پیدا ہوگئی؟ خامسا مسلمانوں نے دانش یونانی کے التباسات کو وحی ربانی کی روشنی میں اور اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے مسلسل چاک کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں وہ گاہے بگاہے التباسات کا شکار ہوئے اور کبھی ایسا بھی لگا گیا قرآنی دائرہ فکر دانش انسانی سے متصادم ہو گیا ہو لیکن بالآخر وحی ربانی نے ان کی دستگیری کی اور وہ انکشاف و تسخیر کی راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ عہد وسطیٰ میں جب مغربی ذہن پر چرچ کی بند دماغی کا تسلط قائم تھا اور جب انسانی ذہن اپنے ہی پیدا کردہ التباسات و مفروضات کا اسیر بن کر رہ گیا تھا اور جب اس تعذیب انگیز گھٹن سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی اس وقت عربی کتابوں کے لاطینی ترجمے اہل مغرب کے لیے آخری منارہ نور کی حیثیت رکھتے تھے، جس سے چھن کر آنے والی روشنی ان کی علمی مجلسوں کی رونق قائم رکھتی۔ گویا آج مغرب ہی کیا ساری دنیا میں علم و فن کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں ان سب کی اساس اسی قرآنی دائرہ فکر میں پائی جاتی ہے جس نے کائنات پر غور و فکر کو ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت دی اور پھر تمام علوم حاضرہ اور متقدمہ سے انکساب کا فن سکھایا۔

تعلیقات و حواشی

- ۱۔ محمد بن اسحاق بن یسار، سیرت ابن اسحاق، تحقیق و تعلیق محمد حمید اللہ، ترجمہ نور الہی ایڈوکیٹ، نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص ۱۵۰۔
- ۲۔ گوکہ بت پرستی کے ذریعہ سماجی نظام کو ایک تقدس عطا کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس خلاء کا احساس بھی پایا جاتا تھا کہ بت پرستی ایک فلسفہ حیات کی حیثیت سے کائنات اور فطرت کے سلسلے میں بنیادی سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ پھر عام زندگی میں بھی بتوں کا احترام یا مسئلہ معروف کی پاسداری اسی وقت تک کی جاتی تھی جب تک ان سے مطلب براری کا امکان پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امراء القیس نے اپنے باپ کے انتقام کے سلسلے میں اپنے بت سے اجازت حاصل کرنے کی تین مرتبہ کوشش کی لیکن جب اسے لگا تاں مطلوبہ اشارے حاصل نہ ہوئے تو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی راہ لی کہ اگر اس بت کے اپنے باپ کا معاملہ ہوتا تو یقیناً اس سردمہری کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اصنام پرستی کے سلسلے میں اس قدر غیر سنجیدہ رویے کی ایک وجہ تو دین حنیف یا دین ابراہیمی کا وہ پس منظر تھا جس کے باقیات کی تلاش کو مستحسن خیال کیا جاتا اور جس کی طرف ایک رومانی رویہ پایا جاتا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اصنام پرستی مکہ کے تاریخی کلچر کا حصہ نہیں تھی اسے بہت بعد کے عہد میں مکہ کے بعض سردار شام سے لے کر آئے تھے جہاں یہ خیال عام تھا کہ ان کی موجودگی سے بارش ہوتی ہے اور دشمنوں پر فتح پانا آسان ہو جاتا ہے۔

(ابن الکلبی، کتاب الاصنام، تعلیق احمد عبید و محمد احمد، قاہرہ ۱۹۹۳ء، ص ۸)۔

- ۳۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۱۲۱۴۔
- ۴۔ عام طور پر سیرت نگاروں نے تجربہ و جی کے سلسلے میں بخاری کی آغاز و جی والی روایت کو ہی اپنا محور و مرکز بنایا ہے۔ ہمارے خیال میں اس روایت میں بعض تفصیلات زیب داستان کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ آپ کو اپنی جان کا خطرہ ہو گیا: لقد خشیت علی نفسی جس کے جواب میں حضرت خدیجہ کو یہ تسلی دینا پڑی: کلا ابشر فواللہ ما یخزیک اللہ ابدا انک لتصلی الرحم و تصدق الحدیث تحمل الكل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق (رواہ البخاری)
- بلکہ اس روایت کے مطابق تو آپ کو اس تجربے کی صحیح ماہیت کا بھی اندازہ نہ تھا وہ تو خدا بھلا کرے حضرت خدیجہ کا کہ وہ آپ

کو لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جنہوں نے آپؐ کی زبانی واقعہ کی تفصیل جاننے کے بعد یہ یقین دلا یا کہ هذا الناموس الذي نزل الله على موسى کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں محمد رسول اللہ کی نبوت کو سند فراہم کرنے کے لیے ورقہ بن نوفل کی تصدیق زیب داستان سے زیادہ نہیں۔ تاریخ و روایت کی دوسری کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

حافظ ابن عساکر نے سلیمان بن طرخان تینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ غارِ اکر کے تجربے کے بعد جب حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا: یا خدیجة ارايت الذي كنت ارى في المنام والصوت الذي كنت اسمعوني اليقظة واهال منه فانه جبريل قد استعلن و اقرأني كلاما فزعت منه ثم عاد الي فاخبرني اني نبي هذه الامة۔

واقعہ نزول کے گرد اساطیری ماحول کی تعمیر میں ان روایتوں کا بھی بڑا دخل ہے جسے بعض سیرت نگاروں نے بلا تحقیق و تجزیہ اپنی تالیفات میں جگہ دے دی اور جس نے گزرتے وقتوں کے ساتھ نقل در نقل کے مرحلے میں استناد کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان روایتوں پر اگر اعتبار کر لیا جائے تو وحی اور تقویض نبوت جیسے قطعی اور حتمی واقعات پر محض ہلوسہ کا گمان ہوتا ہے۔ ہم یقیناً ان سیرت نگاروں کے دلوں کے حال سے واقف نہیں البتہ یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان روایتوں کی زبردست نبوت جیسی حتمی اور قطعی حیثیت پر پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن اسحق نے عبید بن عمرو کی زبانی پہلی نزول وحی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ منصب رسالت سے قطعی میل نہیں کھاتیں۔ بقول راوی جب آپؐ پہلی وحی کے بعد گھر کی طرف چلے تو راستے میں آسمانی آواز سنی کہ یا محمد انت رسول الله وانا جبرئیل حضورؐ نے ادھر ادھر دیکھا جب کچھ نظر نہ آیا تو اوپر نگاہ کی۔ دیکھا کہ وہ جبرئیل ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔ حضورؐ نے گھر آ کر جب یہ واقعہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا تو ان کا فوری رد عمل تھا انی لارجوان تکون نبي هذه الامة۔ یعنی مجھے یقین ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔ اس طرح کی روایتوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گویا نبوت کوئی کسی منصب ہو جس کے حصول کے لیے میاں بیوی مل کر اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ابن اسحق نے بعض ایسی روایتوں کو بھی جگہ دی ہے جو بظاہر تو ذاتِ اقدس کے سلسلے میں غلو کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں البتہ ان روایتوں کے سہارے ایک ایسا اساطیری ماحول تشکیل پاتا ہے جس میں نبوت جیسی قطعی شے محض ایک نفسیاتی اور روحانی تجربہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد عن یونس کی روایت میں ابن اسحق نے لکھا ہے کہ بعثت نبویؐ سے چند سال پہلے ہی جب آپؐ کسی حجر و شجر کے پاس سے گزر رہے تھے تو وہ تسلیمات بجالاتے آنحضرتؐ ان کے سلام کو سنتے، ارد گرد دیکھتے لیکن انہیں درختوں اور پتوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آتا۔ آپ کو صرف السلام علیک یا رسول اللہ کی صدا سنائی دیتی۔ تو کیا محمدؐ رسول اللہ کو نزول وحی سے پہلے اپنے اس منصب عظیم کے ملنے کا احساس تھا؟ ہمارے خیال میں اگر ایسا ہوتا تو جبرئیل کے اچانک سامنے آ جانے سے آپؐ اتنے متوحش نہ ہوتے۔

تاریخ و روایت کے مطالعے کے دوران ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ روایت نویسوں نے مختلف مآخذ سے جو مواد ہمارے لئے اکٹھا کیا ہے ان کے مجموعی مطالعے اور تحلیل و تجزیہ کے نتیجے میں ہم کسی حد تک اس تاریخی پس منظر کو متصور کر سکتے ہیں اور بس۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس عمل میں قرآن مجید کی روشنی اور غیر تقلیدی ذہن کی رفاقت ہمیں حاصل ہو، ورنہ مختلف قسم کے قصص کا ذہب کوچ جان کر ہم ایک بہت ہی بھونڈی اور مجہول تصویر متشکل کر پائیں گے۔ ذرا غور کیجئے کیا عقل سلیم اس بات کی شہادت دے سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ کو، جنہیں مہبط وحی کے شرف سے نوازا گیا اور جنہیں نبوت جیسی عظیم ذمہ داری سونپی گئی، انہیں تو اپنی نبوت کے سلسلے میں تذبذب ہو لیکن ورقہ بن نوفل اور خدیجہ بنت خویلد انہیں اس



العالمی کی تشریح الافلاک کا ایک صفحہ

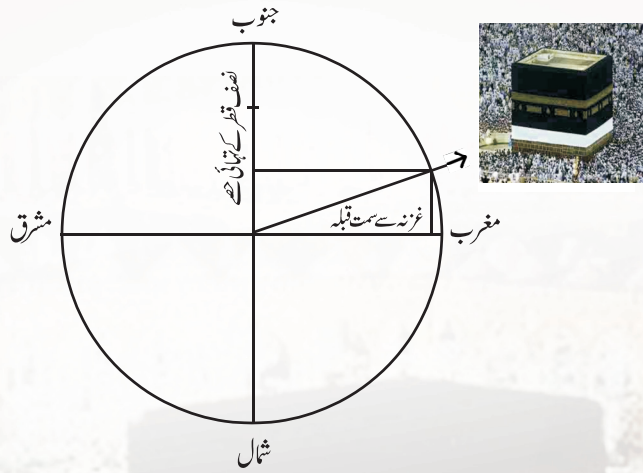
بات کا یقین دلائل کے اے محمد یقین جانے خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے اور یہ کہ آپ کے پاس جو بیغما بر آتا ہے وہ کوئی اور نہیں وہی ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰ کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ احمد بن یونس کی ایک دوسری روایت میں تو ابن اسحاق نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جبریل کی اصل حقیقت کے سلسلے میں آپ خاصے متذہب تھے سو خدیجہؓ نے آپ کی دلجمعی کے لئے کہا کہ وہ جب آئیں تو آپ مجھے اطلاع دیں۔ پھر اچانک ایک دن جبریل تشریف لے آئے۔ آپ نے کہا خدیجہؓ یہ جبریل میرے پاس آئے ہیں۔ خدیجہؓ نے پوچھا کیا آپ انہیں دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! خدیجہؓ نے کہا آپ میرے بائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپ بائیں جانب آکر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! خدیجہؓ نے کہا: آپ میری دائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپ اٹھے اور خدیجہؓ کے دائیں جانب آکر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! کہا آپ آکر میری گود میں بیٹھ جائیں۔ سو رسول اللہ گود میں بیٹھ گئے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا کہ کیا اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! راوی کہتا ہے کہ پھر خدیجہؓ نے اپنا چہرہ کھول دیا اور اپنی اونٹنی اتار دی اور آپ بدستور گود میں بیٹھے رہے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا: کیا آپ انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا نہیں۔ خدیجہؓ نے کہا: اے ابن عم یہ شیطان نہیں فرشتہ ہے آپ کو بشارت ہو (ابن اسحاق حوالہ مذکور ص ۱۷۳)۔ احمد بن یونس کی ایک دوسری روایت میں یہاں تک ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ کو اپنے کرتے کے اندر داخل کر لیا تو جبریل واپس چلے گئے، جس سے خدیجہؓ نے استنباط کیا کہ یقیناً یہ فرشتہ ہے شیطان نہیں۔ (ابن اسحاق حوالہ مذکور ص ۱۷۴)

ہمارے خیال میں اس قسم کے قصہ کا ذہن پر وہی لوگ یقین کر سکتے ہیں جنہیں منصب نبوت کی عظمت کا واقعی احساس نہ ہو۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ابن اسحاق، جنہیں ہمارے ہاں پہلے باقاعدہ سیرت نگار کی حیثیت حاصل ہے، نے اس طرح کی خرافات کو اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے اور ورقہ بن نوفل کی تصدیق نبوت محمدی کے واقعہ کو تو بخاری و مسلم جیسے اجل محدثین نے کیف بدالوحی کے باب میں درج کر رکھا ہے۔

۵۔ A. J. Wensinck, "Kibla," in *The Encyclopedia of Islam* vol. 5 Leiden, E.J. Brill, 1960), pp. 189-93.

۶۔ Suliman Bashear, "Qibla Musharriqa and Early Muslim Prayer in Churches", *The Muslim World*,

81, no. 3-4 (1991): 268.



۸۔ David A. King, *Astronomy in the Service of Islam* (Brookfield, 1993), p.257

۹۔ David A. King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and*

Instrumentation in Medieval Islamic Civilization (Leiden, Netherlands: E. J. Brill, 2004), p.215.

۱۰۔ الخوارزمی (متوفی ۸۴۷ء) اور البتانی (متوفی ۹۲۹ء) نے مختلف علاقوں سے تعیین قبلہ کے لیے جو جدولیں تیار کی تھیں وہ آگے چل کر حبش الحسیب (متوفی ۸۶۴ء) ابن الہیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) اور البیرونی (متوفی ۱۰۵۰ء) کے ہاتھوں مزید فی باریکیوں کے ساتھ مرتب ہوئیں۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی میں ابوالمرقش کی نئی تحقیق اور نئے فارمولے کی بنیاد پر دمشق موقیت الخلیلی نے مختلف علاقوں کے لیے سمت قبلہ کے تعیین کا حیرت انگیز جدول تیار کر ڈالا۔ Samso, Julio. "Astronomical

Tables and Theory." in *The Different Aspects of Islamic Culture*. Vol. 4: Science and Technology in

Islam. (Ed. A.Y. Al-Hassan) Part 1: The Exact Sciences, Paris: UNESCO, pp. 209-234.

۱۱۔ علم المیقات کے سلسلے میں چشم کشا مباحث کے لیے دیکھئے: David A. King, *Astronomy in the Service of Islam*

اور *In synchrony with the Heavens*۔

۱۲۔ اوقات صلوٰۃ کی تحدید ہی پر کیا موقوف ابتدائے عہد میں دن اور رات کے مختلف پہروں کا تعین بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ دن میں سورج کے گھٹنے بڑھتے سائے اور رات میں تاروں کے مقام سے آگے تحدید وقت کا واحد ذریعہ تھا۔ گویا آسمان کا جتنا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جاسکے تحدید وقت میں کامیابی کا اتنا ہی زیادہ امکان نظر آتا تھا۔ زمین سے مختلف سیارے اپنا زاویہ کس طرح بناتے ہیں اس کی پیمائش پر سب کچھ منحصر تھا۔ وہ اس طرح کہ اگر ایک مثلث کے ایک کنارے ایک تارا ہو اور دوسرے کنارے پر قطب عالم تو پھر تیسرے کنارے سے اس بات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ تارا کس بلندی تک پہنچتا ہے۔ اس حساب کتاب کے لیے Trigonometry کا علم وجود میں آیا اور پھر قدیم اسٹرولوب میں اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ وہ صحیح وقت کا پتہ دے سکے۔ کچھ یہی پیچیدگی سمت قبلہ کے تعین میں پائی جاتی تھی۔ زمین جو ایک بیضوی سطح کی حامل ہے اس کی سطح پر دروازے کے ملکوں سے قبلہ کے تعین کے لیے Spherical Geometry کا علم وجود میں لایا گیا۔ یہاں بھی تاروں کی مدد سے پیچیدہ اعداد و شمار کے ذریعے بالآخر گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نویں صدی میں مسلم ماہرین فلکیات اس لائق ہو گئے تھے کہ Trigonometry کے ذریعے مختلف بلاد و امصار سے سمت قبلہ کا تعین کر سکیں۔ اس سلسلے میں البطانی کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

David King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and Instrumentation in Medieval Islamic Civilization*. 2 vols. Leiden, 2004.

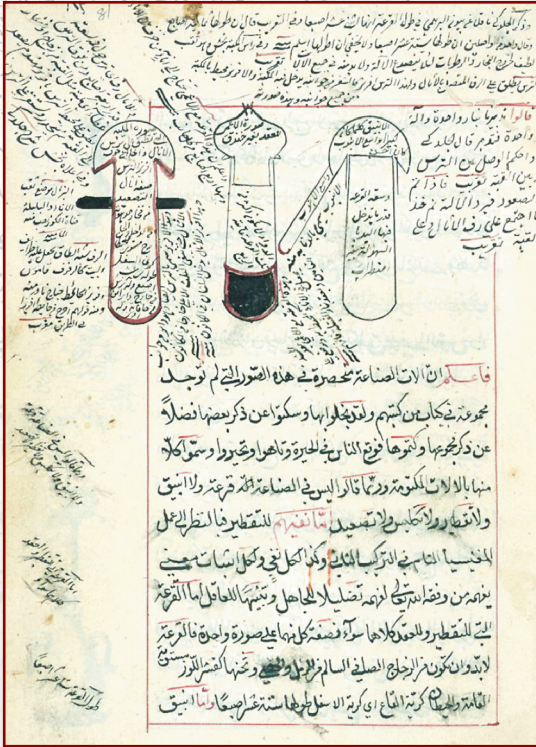
۱۳۔ مثال کے طور پر تقسیم وراثت کے سلسلے میں مروجہ ریاضی کی تنگنائی کا تذکرہ کرتے ہوئے خوارزمی نے ایک دقیق حل طلب مسئلہ یوں متعارف کرایا ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص جو بستر مرگ پر ہے اپنے دو غلاموں سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ تین سو درہم کی ادائیگی پر آزاد تصور کیا جائے گا۔ اس میں سے ایک غلام مر جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک بچی اور دو بیٹوں کو چھوڑ جاتا ہے اور ساتھ میں چار سو درہم کا ترکہ بھی اور تبھی اس کا پرانا آقا بھی داعی اجل کو لبیک کہتا ہے اور وہ اپنے پیچھے تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کو چھوڑتا ہے۔ اب ایسی صورت میں ان بچوں میں سے فی کس کس کو کتنا ملے گا۔ اس قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے الخوارزمی نے الجبر و المقابلہ کا فن ایجاد کیا جس کے ذریعہ بظاہر دماغ بافتہ سوالات کو آسان طریقے سے حل کرنا ممکن ہو گیا۔

۱۴۔ خوارزمی، الجبر و المقابلہ، ۱۹۸۹ء، ص ۴۔

۱۵۔ دوسرے مسلم علمائے سائنس کی طرح البتانی بھی اس نکتے سے پوری طرح آگاہ تھے کہ فلکیات و نجوم کا مطالعہ ایک خدا شناس کا فطری وظیفہ ہے جیسا کہ قرآنی آیات سے استنبہا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مشہور زمانہ ترجیح کے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

إن من أشرف العلوم منزلة وأسنها مرتبة وأحسنها حلية وأعلقها بالقلوب وألمعها بالنفوس وأشدّها تحديداً

للفكر والنظر وتزكية للفهم ورياضة
للعقل بعد العلم بما لا يسع الإنسان جهله
من شرائع الدين وسنته علم صناعة
النجوم لما في ذلك من جسيم الحظ
وعظيم الانتفاع بمعرفة مدة السنين
والشهور والمواقيت وفصول الأزمان
وزيادة الليل والنهار ونقصانها ومواضع
النيرين وكسوفها ومسير الكواكب في
استقامتها ورجوعها وتبدل أشكالها
ومراتب أفلاكها وسائر مناسباتها إلى ما
يدرك بذلك من أنعم النظر وأدام
الفكر فيه من إثبات التوحيد ومعرفة كنه
عظمة الخالق وسعة حكمته وجليل
قدرته ولطيف صنعه قال عز من قائل {إن
في خلق السموات والأرض واختلاف



ابوقاسم محمد بن عبد اللہ الانصاری (بارہویں صدی کی)
تالیف شرح شدور الذهب کا ایک صفحہ

اللیل والنهار لآیات لأولی الألباب} وقال تبارک وتعالیٰ {تبارک الذي جعل في السماء بروجا} وقال عز وجل {هو الذي جعل الليل والقمر نوراً خلفه} وقال سبحانه {هو الذي جعل الشمس ضياء والقمر نوراً وقدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب} وقال جل ذكره {والقمر بحسبان} مع اقتصاص كثير في كتاب الله عز وجل يطول وصفه ويتسع القول بذكره واستشهاد به۔۔ (زيج البتاني، الباب الأول)

۱۶۔ تاریخی تذکروں میں نصیر الدین طوسی کی علمی عظمت ان کی سیاسی شخصیت کے تابع ہو کر رہ گئی ہے بالخصوص سقوط بغداد میں ان کی مخفی سیاست کے سبب عامۃ الناس میں ان کی شخصیت مسموم رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں کتاب الہی اور کتاب فطرت کے علوم مجتمع ہو گئے تھے۔ اگر ایک طرف فلکیات پر ان کی تالیفات اساسی نوعیت کی ہیں تو دوسری طرف روضۃ التسلیم، سیر و سلوک، اوصاف الاشراف اور تجرید الاعتقاد جیسی کتابیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کا شمار وقت کے اہم ترین اسمعیلی علماء میں ہوتا تھا۔

۱۷۔ تاریخ کے ایک طالب علم کو حیرت ہوتی ہے کہ مسلم مورخین نے آخر کیونکر عبد اللہ بن زبیر کو ہماری سیاسی تاریخ سے محو کر رکھا



سجستان میں windmill کا تذکرہ اور اس کی تکنیک کے بارے میں دمشق کی کتاب نخبة الدهر فی عجائب البحر والبر (تیرہویں صدی) میں۔

ہے۔ حالانکہ کوئی ساڑھے نو برس تک وہ عالم اسلام کے ایک بڑے حصے بشمول حجاز پر حکمران رہے۔ زہد و تقویٰ، علم و فضل کی میزان پر بھی وہ عبدالملک سے کہیں فائق تر نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ان کے استحقاق حکمرانی کا دعویٰ اتنا وزنی سمجھا جاتا تھا کہ عبدالملک نے لوگوں کو اس خوف سے حج پر جانے سے روک دیا تھا مبادا وہ ابن زبیر کی باتوں سے متاثر نہ ہو جائیں اور اس طرح بلاد شام کا علاقہ بھی اس کے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ بات جب خراب ہونے لگی اور لوگوں نے حج سے روکے جانے پر احتجاج کیا تو عبدالملک نے بیت المقدس کو ایک متبادل زیارت گاہ کے طور پر متعارف کرایا اور اس قبیل کی روایتیں عام کی گئیں کہ رسول اللہؐ نے تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کا حکم دیا ہے اور یہ کہ بیت المقدس کی وہ چٹان جس پر قدم رکھ کر رسول اللہؐ نے آسمان کی طرف معراج کیا تھا فضیلت میں کعبہ کے ہم پلہ ہے۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا

ہے کہ عبدالملک نے اس چٹان پر ایک خوبصورت گنبد بنوایا اور اہل شام کو اس چٹان کے گرد طواف کی ترغیب دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ترغیب و تحریر کے نتیجے میں اہل شام کے وفود مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لیے پہنچنے لگے۔ حتیٰ کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر وہاں طواف کے ساتھ قربانی اور حلق کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ گنبد میں جنت، جہنم اور پل صراط کی خیرہ کن تصویریں بنائی گئیں اور اس طرح اہل شام کو کعبہ کے مقابلے میں ایک متبادل زیارت گاہ ہاتھ آ گئی۔ وہ تو کہنے کہ عبدالملک کو جلد ہی حجاز مقدس پر تسلط حاصل ہو گیا جس کے سبب اس متبادل زیارت گاہ کی حاجت باقی نہ رہی ورنہ حکمران وقت کی یہ سیاسی مصلحت حج کی صورت شکل بھی مخ کر دیتی۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۱ اور البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۸۱۔

۱۸۔ تاریخ کے متداول مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالملک کے عہد تک بصرہ اور کوفہ میں مالیات اور محصولات کے رجسٹر بزبان فارسی اور شام میں بزبان یونانی لکھے جاتے تھے۔ زاذن فروغ نامی ایک فارسی بصرہ میں مالیات کا ذمہ دار تھا جب کہ دمشق میں اس عہدہ پر ایک عیسائی سرجون بن منصور کو مامور کیا گیا تھا۔

۲۰۔ تاریخ کی کتابوں میں خالد بن یزید بن معاویہ کا تذکرہ ایک ایسے عالم کی حیثیت سے آتا ہے جنہیں دھاتوں کے خواص کی گہری معلومات تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے عبدالملک بن مروان کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ نئے سکے پر سورہ اخلاص کندہ کرائیں۔ (ابولہلال العسکری، کتاب الاوائل، بیروت، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۵)۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خالد بن یزید کی کیمیا میں دلچسپی اساطیری لکھی کے سبب تھی جس کے زیر اثر تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سے لوگ سستی دھاتوں کو کسکی اساطیری فارمولے کے ذریعے سونے میں بدل ڈالنے کے متغنی دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ الیکمیا میں خالد کی تمام تر دلچسپی ایک نئے معیاری سکہ کے قیام کے سبب تھی اور اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے اس فن پر مروجہ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور بالآخر ایک معیاری ٹکسال کے قیام میں اموی سلطنت کی بروقت دستگیری کی۔ کہا جاتا ہے کہ خالد بن یزید نے اہل روم کے آئش یونانی کے مقابلے میں نفیت (یانفیت) نام کا ایک کیمیائی مرکب بھی تیار کر لیا تھا جو اچانک تیزی سے بھڑک اٹھتا تھا۔

۲۱۔ مثال کے طور پر قمری مہینوں کے تعین کے مسئلہ کو لیجئے۔ بطلمیوس نے قمری مہینوں کی پیمائش کے لیے چاند گہن کا سہارا لیا ہے۔ اس کے مطابق دو چاند گہن کے دوران ۱۰،۲۶،۰۰۷ دن اور ایک گھنٹہ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس دوران چاند ۲۶،۰۰۷، ۴ مرتبہ گردش کر چکا ہوتا ہے۔ اگر ۱۰،۲۶،۰۰۷ دن اور ایک گھنٹہ کو ۴ سے تقسیم کیا جائے تو ایک قمری مہینہ ۲۹ دن ۳۱ منٹ، پچاس سیکنڈ، ۸ ثلاثی اور ۲۰ رباعی پر مشتمل ہوگا۔ (یعنی ۲۰، ۸، ۵۰، ۳۱، ۲۹) قمری مہینہ کی یہ پیمائش حجاج بن مطر کی اصلاح شدہ پیمائش ہے ورنہ بطلمیوس کے مطابق ”دن“ کو ”گردش“ سے تقسیم دینے پر حاصل قدرے مختلف نکلتا ہے جو اس طرح ہے۔ (۲۰، ۹، ۵۰، ۳۱، ۲۹) ملاحظہ کیجئے:

Bernard Goldstein, "Ancient and Medieval Values for the Mean Synodic Month", *Journal for the*

History of Astronomy, 34 (2003): 65–74.

George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance*, p. 79–80.

۲۲۔ یہ خیال عام ہے کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی جاہ و چشم کے زمانے میں علوم و فنون کو جو ترقی دی وہ ان کا اپنا طبع زاد کارنامہ نہ تھا بلکہ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ عباسی خلافت کی ابتدائی دو صدیوں میں یونانی علوم و فنون کو بڑی سرعت کے ساتھ عربی میں منتقل کر دیا جس کے نتیجے میں عباسی بغداد میں ایک علمی غلغلہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ البتہ جب یہی علوم بعد کی صدیوں میں لاطینی میں ترجمہ ہو کر اہالیان یورپ کو منتقل ہو گئے تو مسلم تہذیب کی آب و تاب جاتی رہی کہ اس خیال کے مطابق مسلمانوں نے قدماء کے ان علوم کی محض حفاظت کی اور اس کے اطلاقی فوائد کشید کئے جب کہ یورپ نے ان علوم کو ترقی دے کر

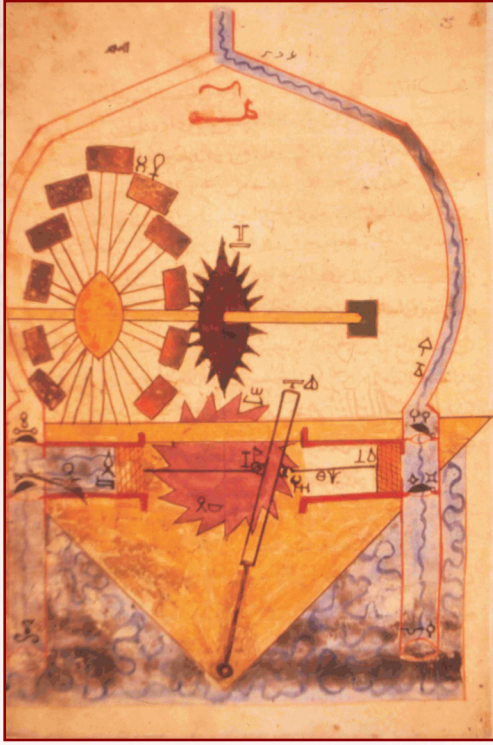
اکتشاف و تخیل کی ایک بالکل ہی نئی دنیا بنا ڈالی۔ ہمارے خیال میں اس قسم کی باتوں پر آج وہی لوگ کان دھر سکتے ہیں جنہیں انسانی تہذیب کی تاریخ سے یکسر نا آگبی ہو یا پھر وہ تعصب اور پروپیگنڈے کا شکار ہوں۔ اولاً تو یہ خیال ہی باطل ہے کہ عہد عباسی کے تحریک ترجمہ سے پہلے فلکیات، جغرافیہ، ریاضی اور فنون لطیفہ کا جزیرۃ العرب اور اس سے باہر مفتوحہ علاقوں میں کوئی وجود نہ تھا۔ اہل مکہ کو ناخواندہ، جاہل اور اجد قوم باور کرانے میں ان بیانات کا بھی دخل ہے جو نیک نیتی سے جاہلیت کا ایک ایسا تصور پیش کرتے ہیں جہاں کوئی تہذیب کسی بھی شکل میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہو سکتا ہے ایسی مبالغہ آرائی سے اسلام کے کارنامے کو اجاگر کرنے میں کچھ وقتی تقویت مل جاتی ہو لیکن ان بیانات کا تاریخی حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ قرآن مجید کا ایک معمولی قاری بھی اس بات کا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبین شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، شمس و قمر کی گردش اور ماہ و سال کی تقویم سے انہیں آگبی تھی۔ فلکیات کے علاوہ رمل، نجوم اور کہانت سے انہیں آشنا ہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سے لے کر ایک لاکھ کی گنتی تک سے نہ صرف واقف تھے بلکہ آیت وراثت کے اندرونی شواہد تو اس بات پر دال ہیں کہ وہ حصص کی پیچیدہ تقسیم کو بھی سمجھنے کے اہل تھے۔ گویا قرآن مجید جیسی عظیم الشان علمی کتاب جس ماحول میں نازل ہو رہی تھی وہاں اس کی تفہیم کی بنیادی استطاعت مخاطبین میں لازماً پائی جاتی تھی۔

ابتدائی مسلم ذہن کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا پروپیگنڈہ ان مستشرقین نے بھی بڑے زور و شور سے کیا ہے جو زوال کی صدیوں میں ہمیں یہ باور کرانے پر مضر رہے ہیں کہ تم نہ کل کسی لائق تھے اور نہ آج ہو سکتے ہو۔ کل یونانی علم و حکمت کے چراغ سے تم نے اپنا گھر روشن کر رکھا تھا تو آج مغرب کے علوم و فنون ہی تمہاری داد رسائی کر سکتے ہیں۔ بیشتر مستشرقین جو مسلم تہذیب کو یونانی علم و حکمت کا خوشہ چیں بتاتے ہیں ان کی فکری جڑیں دراصل Goldziher کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ جو اسلامی عہد کی تمام اکتشافی اور سائنسی ترقیوں کو اجنبی علوم (foreign sciences) کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"The Attitude of Orthodox Islam Toward the 'Ancient Sciences'" in Merlin L. Swartz, (ed), *Studies on Islam*. New York: Oxford University Press, 1981, pp.185-215.

بعد کے مستشرقین نے اپنے طور پر کوئی تحقیق کرنے کے بجائے کلی طور پر Goldziher کے اس خیال کو ایک حتمی صداقت کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں آج بھی یہ خیال عام ہے کہ اسلام اکتشافی ذہن کا مخالف ہے اور شاید اسی سبب موجودہ عالم اسلام میں کائنات پر غور و فکر اور اکتشاف و تخیل کی روایت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔

اس خیال کے حاملین اس پروپیگنڈے کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ یونانی علم و حکمت جب تک اسلامی تہذیب کو تابداد کرتے رہے ان کی ترقی ایک مخصوص سطح سے آگے نہ جاسکی لیکن یہی علوم جب عربی سے ترجمہ ہو کر لاطینی زبان میں یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب کے سائنسی مزاج نے اس سے بالکل ہی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔ اس طرح کی باتیں اگر ایک طرف استعمار کا سیاسی پروپیگنڈہ ہیں اور اس مصنوعی پندار کو قائم رکھنے کے لیے ان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف تاریخ سے سخت ناواقفیت



کا نتیجہ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریک ترجمہ محض یونانی علوم کے تراجم کا نام نہیں تھی بلکہ ان تین سو سال پر مشتمل اس علمی تحریک نے روم و فارس کے مفتوحہ علاقوں میں پائے جانے والے تمام علوم و فنون کا احاطہ کر لیا تھا حتیٰ کہ ہندو چین کے علوم و فنون بھی مسلمانوں کی دسترس میں آ گئے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ انسانی تہذیب اپنے ارتقائی سفر میں جہاں تک پہنچی تھی اس کا نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے بڑی حد تک احاطہ کر لیا تھا بلکہ قرآنی دائرہ فکر کی روشنی میں انھوں نے تحلیل و تجزیے کی ایک معروضی روایت بھی قائم کر ڈالی تھی۔ مروجہ علوم کو جوں کا توں قبول کرنے کے بجائے اسے قرآنی تصورات و معتقدات کی روشنی میں استراد و قبول کا موضوع بنایا گیا۔ اب اس عمل میں انھیں کتنی کامیابی ہوئی یہ ایک الگ مسئلہ ہے جو سر دست ہماری بحث کا محور نہیں ہے۔

الجزری کی کتاب الحیل میں
دوہرے پمپ کی تکنیک جس کے ذریعہ ۱۲ میٹر
کی گہرائی سے پانی نکل سکتا ہے۔

۲۳۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطليموس (تعلیق عبدالحمید صبرہ ونبیل شہابی) قاہرہ ۱۹۷۱ء

۲۴۔ جارج صلیب نے ایک قدیم غیر مطبوعہ مسودے کتاب الہیثمہ میں پائی جانے والی اندرونی شہادت کے حوالے سے اس کتاب کے متداول ہونے پر مطلع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

George Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories During the Golden Age of Islam*, New York University Press, 1994, p.20.

۲۵۔ الْمَعْدَلُ الْمَسْبُور جسے ہم قدیم فلکیات میں Equant کا مسئلہ کہتے ہیں اپنی تمام تر لغویت کے باوجود ایک طویل عرصے تک مشاہداتی علم سے مزاحم ہوتا رہا۔ حالانکہ فی نفسہ اس تصور کی حقیقت قیاس مع الفارق سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس سے زیادہ مہمل اور کیا بات ہوگی کہ یہ تصور کیا جائے کہ کوئی دائرہ جو یکساں رفتار سے اپنے خطوط پر کسی محور کی جانب محو خرام ہو وہ اس

کے مرکز کو مس کئے بغیر اس سے گزر جائے۔ جارج صلیب،
حوالہ مذکور ص ۸۵۔

۲۶۔ متکلمین نے عرض اور جوہر کی جو بحث قائم کی اس میں
وقت کو بھی جوہری پیمانے میں متصور کیا گیا جہاں مسبب
الاسباب خدائے وحدہ لا شریک کی ذات قرار پائی جو تمام
عوامل کا سرچشمہ ہے۔ الرازی نے Absolute Space کا
نظریہ پیش کیا جو ارسطو کے نظریہ مکان کے مقابلے میں نیوٹن
سے کہیں زیادہ قریب ہے۔

۲۷۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطليموس، (تحقیق
عبدالحمید صبرہ ونبیل شہابی) قاہرہ، ۱۹۷۷ء، ص ۶۳۔



۲۸۔ George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance*, London, 2007, pp. 82-83.

عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں اس قسم کے آلات علم و حکمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔ اہل علم انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں رکھنے پر فخر کرتے اور مصوٰ را نہیں اپنی تصویروں کے پس منظر میں دکھاتے۔

۲۹۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطليموس، قاہرہ ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۔

۳۰۔ ابو جعفر البطر و جی (متوفی ۱۰۰ھ) جسے مغرب میں Alpetragius کے نام سے جانا جاتا ہے، نے اپنی معرکہ الآراء تالیف کتاب الحیاة میں بطلموسی ماڈل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ایک نئے علم ہیئت کا ابتدائی خدوخال پیش کیا۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۵۳۱ء میں ویانا میں شائع ہو چکا تھا جبکہ اس کی ایک اور تصنیف کتاب الہیئة کا لاطینی ترجمہ مائیکل اسکوت کے ہاتھوں فریڈرک دوم کے صقلیہ میں تیرہویں صدی میں ہو چکا تھا۔ کوپرنکس، جس نے فلکیات کے مسلم متقدمین کے تذکرے میں خاصے تحفظ ذہنی، ناسپاسی بلکہ سارقانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لئے بھی بطرو جی کو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف *De Revolutionibus Orbium Coelestium* میں کوپرنکس نے لکھا ہے: "Alpetragius superiorem sole Venerem facit, et inferiorem Mercurium" یعنی البطر و جی نے زہرہ کا مقام سورج سے اوپر اور عطارد کا نیچے متعین کیا ہے۔ کوپرنکس کا یہ اعتراف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ البطر و جی کا تصور کائنات افلاطون اور بطلموس سے مختلف ہے جہاں اول الذکر نے ان دونوں سیاروں کو سورج کے اوپر اور آخر الذکر نے دونوں کو نیچے رکھا ہے۔

۳۱۔ قرآن مجید میں حکمت کا لفظ کہیں تو الگ سے آیا ہے اور کہیں کتاب و حکمت کا تذکرہ یکجا کیا گیا ہے۔ جیسے {ومن یوت



الحكمة فقد اوتى خيراً كثيراً {يا ويعلمهم الكتاب والحكمة} (البقرة: ۲۶۹)۔ قرآن مجید نے محمد رسول اللہ کو معلم کتاب و حکمت کے فرض منصبی پر مامور بتایا ہے کتاب سے مراد وحی ربانی پر مشتمل ایک ایسا معین و وثیقہ ہے جس کے بارے میں التباس کی گنجائش کم ہے البتہ حکمت کے تعین کے سلسلے میں ہمارے متقدمین مختلف غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ حکمت قرآن کے علاوہ ایک اور مقابل ماخذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ خیال واثق ہوتا گیا کہ آپ پر کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں نازل کی گئیں۔ ایک کا مجموعہ قرآن مجید کی

سولہویں صدی میں یہ آلے مغرب میں عام ہونے لگے

شکل میں موجود ہے تو دوسرے کا اظہار سنن و روایات کی شکل میں ہوا ہے۔ اس خیال کو قبول عام کرنے میں فتادہ السدوسی متوفی ۱۱۸ھ، ابن وہاب (تلمیذ امام مالک) متوفی ۱۷۹ھ اور امام شافعی متوفی ۲۰۵ھ کا خاص طور پر رول رہا ہے۔ ہمارے خیال میں حکمت کو سنت کا ہم معنی قرار دینا اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کے صفحات اس بات پر دلالت دیتے ہیں کہ کتاب و حکمت بیک وقت انبیاء سابقین کو بھی عطا کی جاتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح کے سلسلے میں یہ کہنا کہ {ويعلمه الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل} (آل عمران: ۴۸) یا آل ابراہیم کے سلسلے میں قرآن مجید کا یہ بیان کہ {فقد آتينا آل ابراهيم الكتاب والحكمة} (نساء: ۵۴) یا حضرت لقمان کے حوالے سے یہ کہنا {ولقد آتينا لقمان الحكمة} (لقمان: ۱۲) گویا اس خیال کی تائید ہے کہ حکمت کو محمد رسول اللہ کی سنت پر محمول کرنا ان قرآنی بیانات کی صحیح تفہیم نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اگر حکمت سے مراد سنت رسول لیا جائے تو یقیناً احادیث و روایات کے مجموعے آل ابراہیم حضرت مسیح اور لقمان پر نازل نہیں کئے گئے تھے۔

بعض شارحین نے کتاب و حکمت کی ثنویت کا ایک حل یہ نکالا کہ انھوں نے حکمت کو قرآن سے باہر تلاش کرنے کے بجائے خود کتاب کے اندر اس کی موجودگی کی نشاندہی کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے خود اپنے آپ کو ایک جگہ حکمت بالغہ سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ مختلف مقامات پر کتاب کے ساتھ حکمت کا لاحقہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کتاب عظیم کی عقدہ کشائی اور اس کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کے لیے حکمت کا سہارا لازم ہے۔ پھر یہ حکمت ہے کیا؟ قرآنی بیان کے مطابق یہ وہی شے ہے جو داؤد کی ملک گیری میں ان کی رفیق و پاسبان بنی اور کتاب و حکمت کا یہی تحفہ جب آل ابراہیم کو عطا

ہوا تو مقتدر حکمرانی ان کے حصّے میں آگئی {فقد آتینا آل ابراهيم الكتاب والحكمة واتیناهم ملکا عظیما} {نساء۔ ۵۴} خدا جسے چاہتا ہے حکمت سے نواز دیتا ہے {یوتی الحکمة من یشاء} {بقرہ۔ ۲۶۹} اور جسے خدا حکمت سے نواز دے گویا اسے خیر کثیر سے نواز اگیا۔ ان قرآنی بیانات سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکمت ایک ایسا خیر کثیر اور ایک ایسی نعمت عظیم ہے جو اقوام و ملل کو استخلاف فی الارض کی مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ داؤد و سلیمان کی سلطنتوں کا جاہ و حشم اسی حکمت کے نتیجے میں قائم ہوا تھا اور خود آپؐ پر آنے والی وحی ایک ایسی عقل حکیم اور قلب سلیم کی تعمیر کا کام کر رہی تھی جس کے نتیجے میں آنے والے دنوں میں استخلاف فی الارض اس کا مقدر تھی۔ معاصرانہ بیان میں اگر کہا جائے تو مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکمت سے مراد ایک ایسے عقلی رویہ کی تشکیل و تعمیر ہے جو کائنات کو متناشائے مضیٰ سمجھنے یا اس کی سریت سے خوف کھانے کے بجائے اس کی تسخیر کا فریضہ انجام دے سکے۔ داؤد نے اسی عبودیت کاملہ سے سرشار ایک عقلی رویے کے ذریعے ایک ایسی سلطنت کی تشکیل دی جس کی حکمرانی شرق و غرب، پہاڑوں اور پرندوں تک محیط تھی۔ قرآنی بیان کے مطابق پہاڑوں کو ان کے لیے اس طرح مسخر کر دیا گیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ خدا کی حمد میں رطب اللسان رہتے اور اسی طرح پرندے خدا کی تمہید میں ان کے شریک و سہیم نظر آتے اور یہ سب کچھ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ {واتیناہ الحکمة وفصل الخطاب} {ص: ۲۰}۔ داؤد و سلیمان کے جاہ و حشم کے بیان میں جن میر العقول ایجادات کا تذکرہ ملتا ہے پہاڑوں اور فضاؤں پر ان کا مکند ڈالنا، پرندوں اور چوہٹیوں پر ان کی حکمرانی دراصل اسی خیال کی توثیق کرتی ہیں کہ حکمت اگر وحی کی رفیق بن جائے تو انسان کے لیے کائنات کی تسخیر صرف آسان ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ایک ایسی جنت ارضی کی تشکیل کر سکتا ہے جہاں خدا کے انعامات پر لقمان کی طرح مومنین کے سرشکر سے جھک جاتے ہوں اور جہاں داؤد ان تمام انعامات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اپنا شمار اواب میں کراتے ہوں۔

۳۲۔ جابر بن حیان (محولہ فواد سیزگن، ص ۲۲۷)

۳۳۔ القانون المسعودی، ج ۱، ص ۴۵۔

۳۴۔ تاریخ کا یہ بھی عجیب طرز ہے کہ نزول قرآن سے تسخیر و اکتشاف کی جو غفلہ انگیز تحریک بلند ہوئی اور جس کے نتیجے میں تجرباتی اور مشاہداتی منہج علمی کو فروغ نصیب ہوا اسے آج مغرب میں فرانس بیکن کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیکن نے ارسطو کی Organon کے مقابلے میں Novam Organum شائع کیا جس میں تجربے اور مشاہدے کو علم کی بنیاد قرار دیا گیا۔ آگے چل کر بیکن کا یہ منہج علمی سائنسی طریقہ کار کے طور پر متعارف ہوا۔ اور اس طرح یہ سمجھا جانے لگا کہ جدید دنیا جو تجرباتی سائنس کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اس کے بانی مبانی کی حیثیت فرانس بیکن کو حاصل ہے۔ علمی حلقوں میں بیکن کو father of modern empiricism بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کو تاریخ کی معمولی سی شہ بُد بھی ہوگی ان کے لیے اس بات کا انکار کرنا مشکل ہوگا کہ غور و فکر کا جدید سائنسی منہج، جہاں منقولات سے زیادہ مشاہدات کو دخل ہے، عہد وسطیٰ کے



مسلمان علماء میں ایک مقبول عام منہج کی حیثیت سے رائج رہا ہے۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم کو لیجئے جو بابائے بصریات (father of optics) کی حیثیت سے مشرق و مغرب میں یکساں احترام سے دیکھے جاتے ہیں، انھوں نے نہ صرف انسانی تجربہ اور مشاہدہ کی سریت کو بے نقاب کیا بلکہ اہل علم کو وہ اس بات پر مسلسل آگاہ بھی کرتے رہے کہ ”حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔“ ابن الہیثم کا منہج بنیادی طور پر ان شبہات کو تجربے اور مشاہدے کی میز پر رکھنے سے عبارت ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

تمثیل کردہ ارضی
صانع: جعفر ابن عمر ابن دولت شاہ الکرمانی (چودھویں صدی)

... رأینا أن نصراف الاهتمام الى هذا المعنى

بغاية الامكان ونخلص العناية به ونوقع الجد في البحث عن حقيقته ونستأنف النظر... في مباديه و مقدماته ونبندیء بالاستقراء الموجودات و تصفح أحوال المبصرات و تمييز خواص الجزئیات و نلتقط باستقراء ما يخص البصر في حال الابصار و ما هو مطرد لا يتغير و ظاهر لا يشبهه من كيفية الاحساس... ثم نترقى في البحث و المقایيس على التدریج و الترتیب مع انتقاد المقدمات و التحفظ من الغلط في النتائج و نجعل غرضنا في جميع ما نستقرئه و نتصفحه استعمال العدل لا اتباع الهوى و نتحرى في سائر ما نمیزه و ننتقده طلب الحق لا الميل مع الاراء... فلعلنا ننتهي بهذا الطريق الى الحق الذي به يثلج الصدر و نصل بالتدرج و التلطف الى الغاية التي عندها يقع اليقين و نظفر مع النقد و التحفظ باحليقة التي يزول معها الخلاف و تنحسم بها مواد الشبهات... و ما نحن من جميع ذلك براء مما هو في طبيعة الانسان من كدر البشرية و لكننا نجتهد بقدر مالنا من القوة الانسانية و من الله نستمد العون في جميع الامور۔

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف، جابر بن حیان کا کلیہ توازن، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، اور ان کا یہ اصرار کہ ”لیس لاحدان يدعى بالحق انه ليس في الغائب إلا مثل ما شاهد او في الماضي والمستقبل إلا مثل ما في الآن“ دراصل اسی تجرباتی منہج کا عکاس ہے جس کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیات اکتشاف ہیں جس نے متبعین محمد کو ایک نئے منہج علمی سے روشناس کرایا تھا۔ بھلا جو کتاب اپنے متبعین سے ہانکے پکارے یہ کہہ رہی ہو کہ سنرہم آیاتنا فی الآفاق و فی

انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق (فصلات: ۵۳) اور جس کے ہاں بصارت کی درستگی پر اس قدر اصرار ہو کہ خدا خود کہتا ہو ما ترى في خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر هل ترى من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاساً وهو حسير (الملک: ۳۴) بھلا اس کے حاملین تجربہ اور مشاہدہ سے کیسے پہلو تہی کر سکتے تھے۔ جو کتاب اپنے متبعین سے واشگاف الفاظ میں یہ کہتی ہو کہ وجعل لكم السمع والابصار والافئدة لعلكم تشكرون (النحل: ۷۸) اور جو انھیں ان تجرباتی اور مشاہداتی خصائص کے لیے موصول بھی ٹھہراتی ہو: ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسؤولاً (الاسراء: ۳۶) بھلا اس کے حاملین اس منہج علمی سے کیونکر روگردانی کر سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نئے منہج علمی نے غور و فکر کے پرانے مناہج کو تہہ بالا کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے تسخیر واکتشاف کی ایک نئی دنیا وجود میں آگئی۔ نزول قرآن کے بعد انسانی تہذیب پھر ویسی نہ رہی جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

۳۵۔ جابر بن حیان، محولہ نواد سیزگن، ص ۲۲۷

۳۶۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطليموس، حوالہ مذکور، ص ۳۴۔

۳۷۔ رصدگار ہوں کو ہمیشہ سے عالم اسلام میں مشاہداتی اور تجرباتی علوم کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔ عہد مامون میں شمسائے بغداد کے بعد، جسے غالباً پہلی باقاعدہ رصدگاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، آنے والے دنوں میں رے، اسفہان اور شیراز میں قائم ہونے والی رصدگار ہوں نے شہرت حاصل کی۔ البتہ مراغہ اور سمرقند کی رصدگار ہوں کو ان کے غیر معمولی کارناموں کے سبب انسانی تاریخ میں ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ سمرقند میں الخ بیگ کی مشہور زمانہ رصدگاہ آج بھی ناظرین پر اس عہد کے علمی جاہ و جلال کا نقش مرسم کرتی ہے۔ جوں جوں رصدگار ہوں کے آلات میں ترقی ہوتی گئی زمین اور اس کے مابین ہماری معلومات میں قطعیت کا عنصر آتا گیا۔ رصدگار ہوں کے عہد میں جب دنیا جدید الکٹرونک آلات سے بے خبر تھی محیط ارضی Circumference کی پیمائش ۲۴,۸۳۵ میل کی گئی تھی جو موجودہ پیمائش ۲۴,۹۰۶ میل سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔

۳۸۔ الکندی وہ پہلا شخص ہے جس نے آسمان کے بظاہر لا جو ردی نظر آنے کی توجیہ کی۔ وہ کہتا ہے ”فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اثر پذیر ہو کر ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا ہیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ہیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے۔ (چنانچہ) ہمارے سروں پر جو تار یک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کی بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وہی یہ لا جو ردی رنگ ہے۔“ (محولہ نواد سیزگن، ص ۱۳۶)

۳۹۔ بقول الکندی ”جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے



کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں۔

تو کیا اٹھارہویں صدی کے مغربی اہل اکتشاف الکندی کی ان توجیہات سے واقف تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے اصل ماخذ کا ہمیں ادراک ہوتا جائے گا اس قسم کے تہذیبی تعاملات پر فیصلہ کن گفتگو ممکن ہو سکے گی۔ اس بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو کے لیے پانچواں باب ملاحظہ فرمائیں۔

۴۰۔ مغرب میں ایک طویل عرصہ سے Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ یہ آلہ البیرونی کی دسترس میں تھا ورنہ وہ صحرا نوردی کے بغیر پیمائش محیط ارضی کی بات نہ کرتا۔

اس کے علاوہ نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ میں بھی اس کا استعمال عام تھا۔ استنبول میں واقع تقی الدین کی رصدگاہ میں آج بھی یہ آلہ ہمیں تاریخی التباسات کی درستگی کی دعوت دے رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

A. Y. Al-Hassan, (ed.), *The Different Aspects of Islamic Culture*. Vol 4: Science and Technology in Islam. Paris: UNESCO Publishig, pp. 235-265.

۴۱۔ مامون کا خریطہ عالم گو کہ یونانی تصور عالم کے مطابق دنیا کو ہفت اقالیم میں منقسم دیکھتا ہے البتہ اس اعتبار سے یہ دنیا کا پہلا نقشہ ہے جو دنیا کے ۱۵۳۰ ہمشہروں، پانچ سمندروں، ۲۹۰ دریاؤں، دوسو پہاڑوں کے علاوہ مختلف علاقوں میں پائی جانے والی قیمتی دھات اور پتھروں کا تذکرہ کرتا ہے۔ المسعودی نے اس منصوبے کی وسعت اور ہمہ گیری پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ کتاب التنبیۃ والاشراف۔

۴۲۔ البیرونی کے عہد تک علوم ارضیات کے مختلف مدارس فکر پائے جاتے تھے مثال کے طور پر عباسی خلیفہ المنصور (۷۵۳-۷۵۵) کے زمانے میں اس موضوع پر سنسکرت سے سورہ سدھانت کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ آریہ بھٹ کی قدیم تصنیف سے بھی عرب ناواقف نہیں تھے جس میں ارض وسموات کی گردش پر بحث کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس

زمین پر پانی اور خشکی کے حصے تقریباً برابر ہیں۔

S. Maqbul Ahmad "Djughrafiya." in *Encyclopedia of Islam* Leiden: Brill, 1991, vol 3. pp. 575-587.

۴۳۔ ملاحظہ ہو: ابوریحان البیرونی، کتاب تحديد نهاية الاماكن لتصحيح مسافة المساكن، حوالہ مذکور۔

۴۴۔ ابن الہیثم نے اپنی جس شہرہ آفاق تصنیف الشکوک علی بطليموس میں بطلمیوسی نظام کو قیاس مع الفارق قرار دیا وہ غالباً لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے سے رہ گئی جیسا کہ جارج صلیب کا خیال ہے۔ ابن الہیثم نے سیاروں کی حرکات کی جو توجیہ پیش کی اور جسے اس نے نظام طبعی کا نام دیا اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتا ہے:

”وہ مقدمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب مبنی ہے، چار ہیں۔ ایک یہ کہ جسم طبعی خود ایک سے زیادہ طبعی حرکت نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسم طبعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جسم آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے۔“ (محولہ فواد سیزگن ص، ۱۰۲۱۰۳)

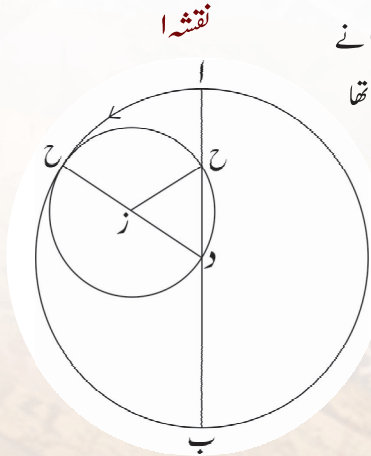
۴۵۔ ابوریحان البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) نے اپنی جس تصنیف میں بطلمیوس کو ہدف ملامت بنایا ہے اس کا صرف تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ابطال الہتتان باراد البرہان کے حوالے سے قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) نے بیرونی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ محولہ

George Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories during the*

Golden Age of Islam, New York University Press, 1994, p. 279.

۴۶۔ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ابن شاطر (متوفی ۷۵۱ھ) نے

بطلمیوسی نظام کو مسترد کرتے ہوئے جس نئے نظام کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ وہی کچھ تھا جس کا سہرا کوپرنکس کے سر باندھا جاتا ہے۔ کوپرنکس اور ابن شاطر کے نقشوں پر کوئی اگر ذرا بھی ایمان داری سے نگاہ ڈالے گا تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کوپرنکس کی تمام تر تحقیق ابن شاطر اور ان کے دیگر مسلم متقدمین کی علمی کاوشوں کا چرہ بہ ہے۔ ملاحظہ ہو نقشہ ایک اور دو سے نقشہ تین کی مماثلت:



نقشہ ایک اور دو نصیر الدین طوسی کی مشہور زمانہ کتاب تذکرۃ فی علم الہنیۃ ۱۲۶۱ء سے ماخوذ ہے۔ جس میں سیاروں کی گردش الصغیرہ والکبیرہ (Tusi-Couple) کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ اس نقشہ میں دو دائرے ہیں جس میں چھوٹے دائرے کا قطر بڑے دائرے کا نصف ہے۔ بڑے قطر کو الف، ح، د، ب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں چھوٹے دائرے کے بارے

میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گھڑی کی سمت گھومتا ہے جب کہ بڑا دائرہ مخالف سمت میں اس کی آدھی رفتار سے گردش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بظاہر اپنی گردش کے باوجود الف اور ب کے درمیان ہی نظر آتا ہے۔



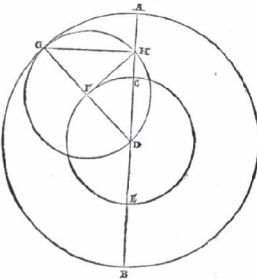
نقشہ ۲

نقشہ دو میں طوسی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹا دائرہ جب بڑے دائرے کے اندر اس کی دوگنی رفتار سے مخالف سمت میں گردش کرتا ہے تو ناظرین کے لیے یہ منظر اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سے پہلے خانہ میں جب چھوٹا دائرہ بڑے دائرے کے نصف اوپری حصہ میں ہوتا ہے وہ اس طرح کہ بڑا دائرہ گھڑی کی اٹنی سمت اور چھوٹا دائرہ گھڑی کی سمت میں گردش کرتا ہے تو بالآخر چوتھے خانے کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہاں چھوٹا دائرہ ڈیڑھ مرتبہ



Vod igitur iste motus apparentijs' contentat amodo declarabimus. Interim uero quæret aliquis, quo nam modo possit illarum librationum æqualitas intelligi, cum à principio dictum sit, motum celestem æquale esse, uel ex æqualibus ac circularibus cõpositum.

Hic aut utrobique duo motus in uno apparēt sub utrisque terminis, quibus necesse est cessationē interuenire. Fatebimur quidem geminatos esse, at ex æqualibus hoc modo demonstrant. Sit recta linea AB, quæ quadrifaria secetur in CD & E, & in D describatur circuli homocentri, ac in eodē plano AD & CD & E, & in circuli interioris circuli affluat utriusque signū, & in ipso cetero, intervallo uero ED circulus describatur GHD, qui secet AB rectā lineā in H signo, & agat dimetiens DEO. Ostendendū est, qd geminis motibus circulorū GHD & CE cõcurrentibus in



گھوم چکا ہوتا ہے جب کہ بڑا صرف تین چوتھائی گھومتا ہے۔ یہ صورتحال جب دور سے دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ چھوٹا ہمیشہ بڑے کے قطر پر ہی گھومتا رہا ہے۔

اب طوسی کے ان ڈائیگرام کا نکولائی کوپرنکس کے ڈائیگرام سے تقابلی مطالعہ کریں تو حقیقت حال کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش نہیں آتی۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ کوپرنکس نے اپنی ڈرائنگ میں Tusi-Couple کا ہی سہارا لیا ہے اس کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ اس نے عربی

Source: De Revolutionibus Orbium Coelestium (1543)

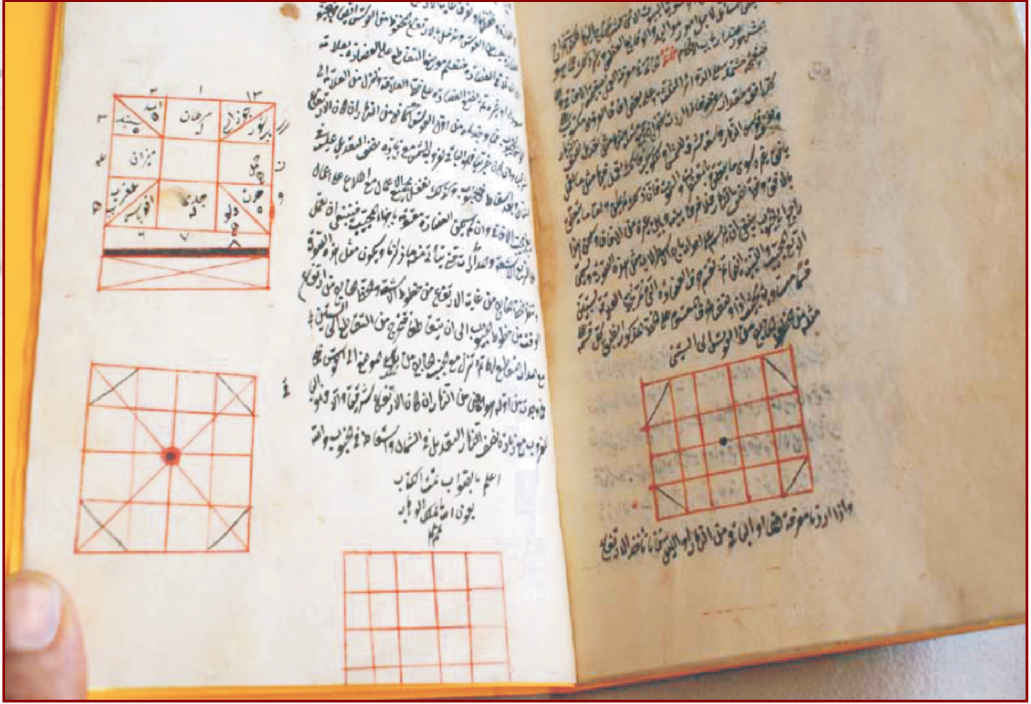
نقشہ ۳

تجی کو رومن حروف سے بدل کر ایک خالص یورپی بازیافت کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ خیال کہ بطلمیوسی نظام حرکت کائنات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا مسلم ماہرین فلکیات کے درمیان خاصا مقبول رہا ہے۔ سب سے پہلے ابن ابیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) نے بطلمیوسی نظام کی کھل کر تنقید کی البتہ ایک متبادل نظام کا تصور ابن شاطر (متوفی ۱۳۵۷ء) کے لیے مقدر تھا جسے پیرامیٹر کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد (یعنی زمین کے بجائے سورج کو مرکز قرار دے کر) کوپرنکس نے مغرب میں متعارف کرایا۔ کوپرنکس اور گلیلیو کی مشترکہ کوششوں کے سبب اہل مغرب کو ایسا محسوس ہوا گویا انھوں نے کائنات کی حرکت کا راز دریافت کر لیا ہو۔ اس احساس نے بعض بنیادی فکری تبدیلیوں کی اینٹ رکھ دی۔

۱۹۵۷ء میں غالباً پہلی بار اہل علم کو اس بات کا انکشاف ہوا کہ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے ابن شاطر نے Tusi-Couple کی بنیاد پر جو نیا خاکہ ترتیب دیا تھا اس میں زمین کی جگہ سورج کو رکھ کر کوپرنکس نے مغرب میں خود کو اس فن کے امام کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ ابن شاطر کی کتاب نہایۃ السؤل فی تصحیح الاصول پندرہویں صدی میں اٹلی میں پہنچ چکی تھی۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وینٹیکن کی لائبریری میں یقیناً کوپرنکس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا کہ اس کتاب کا وینٹیکن کی لائبریری میں پایا جانا اور کوپرنکس کا وہاں جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے ابن شاطر اور کوپرنکس کے ڈائیکرام میں حیرت انگیز طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔



ملاحظہ کیجئے: بطلمیوسی نظام کے بالمقابل ابن شاطر کا تصور جہاں الصغیرہ والکبیرہ (Tusi-Couple) کی مدد سے عطارد کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔



ناصرالدین طوسی کی کتاب میں استرلوب کی دقیق بحث

اس بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے:

George Saliba *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories during the Golden Age of Islam*, George Saliba, Islamic Science and the Making of European Renaissance, New York, 1994, p. 236.
George Saliba (2007), Lecture at SOAS, London-Part 4/7 (<http://youtube.com/watch?v=GfissgPCgfm>) and Lecture at SOAS, London-Part 5/7 (<http://youtube.com/watch?v=OVMBRAD6YBU>)

۴۸۔ جابر نے پہلی بار اشیاء کے خواص کی عددی توجیح کے ذریعے ایک ایسے علم کی بنیاد رکھ دی جو آگے چل کر حیرت انگیز علمی انقلاب کا باعث ہوئی۔ پھر انسانوں کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ مختلف اشیاء میں اجزاء کا پتہ لگا سکیں اور اس کی ترتیب و تزئین میں رد و بدل کے ذریعے نئی اشیاء کی تخلیق کریں۔ جابر کے مطابق توازن یا المیزان کا یہ اصول جس نے دریافت کر لیا اسے گویا کائنات کے بنیادی راز سے آگہی حاصل ہوگئی۔ (مولہ نوادیر گن، ص ۷۷)

۴۹۔ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام کو ایک ایسی غالب تہذیب کی حیثیت حاصل تھی جہاں سے فکری و ادبی رجحانات کو برآمد کرنا باعث فخر سمجھا جاتا۔ مغربی اہل فکر عالم اسلام کی طرف اسی مرعوبانہ نگاہ سے دیکھتے جس طرح آج تیسری دنیا کے ممالک مغرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے علمی مباحث سے باخبری، فیشن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر جابر کے

ایک ایسے آدمی پر تنقید کر رہا ہوں جس کے سمندرِ علم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن مجھے احساسِ ممنونیت اور

عظمت اس بات سے نہیں روکتی کہ میں ان غلطیوں کی طرف اشارہ کروں جو مجھ پر منکشف ہو گئی ہیں۔

۵۸۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور ص ۴۵

۵۹۔ ایضاً ص ۴۶

۶۰۔ ایضاً ص ۴۶

۶۱۔ ایضاً ص ۴۶

۶۲۔ ایضاً ص ۵۱

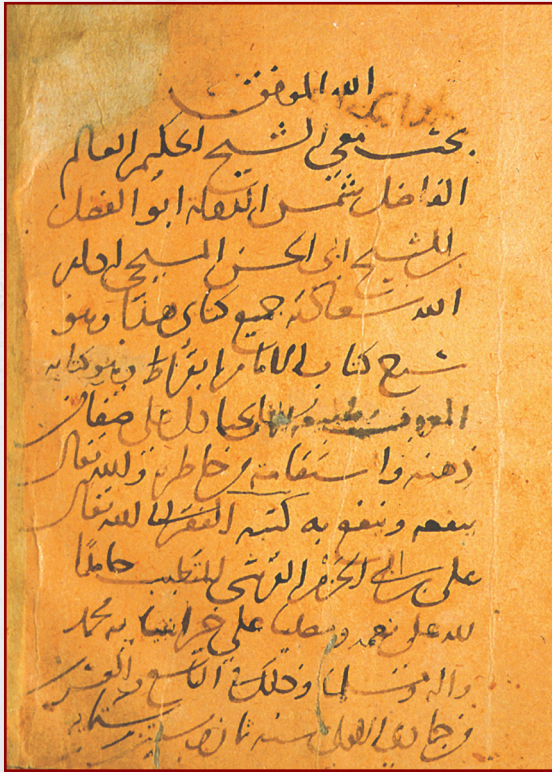
۶۳۔ Ehsan Masood, Science and Islam: A History, London, 2009, p.162

۶۴۔ حوالہ مذکور ص ۷۴

۶۵۔ ایضاً ص ۷۲

۶۶۔ مثال کے طور پر تھیوڈور ابوثرئی (متوفی ۸۲۶ء)

جو ایک عیسائی عالم تھے اور جنہیں اموی خلافت کے زمانے میں بعض دفتری امور کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا مترجم کی حیثیت



جب مسلم علماء کی سند توصیف اہل یورپ کے لئے باعث صداقت تھی۔
ابن نفیس کا وہ اجازت نامہ جو انھوں نے ابوالفضل المسی
کو ۱۲۷۷ء میں عطا کیا۔

سے خاصی شہرت رکھتے ہیں ثابت بن قری (متوفی ۹۰۱ء) جنھوں نے علم ہندسہ اور ریاضی کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا مذہباً صابی تھے۔ خود عثمان بن اسحاق جنھیں بہت سے اہم ترجموں کی نگرانی پر مامور کیا گیا وہ مذہباً عیسائی تھے۔

۶۷۔ بعض مستشرقین نے یہ تاثر عام کر رکھا ہے کہ اسلامی تہذیب یا مسلم معاشرہ سائنسی ارتقاء کے لیے مناسب ماحول فراہم نہیں کرتا۔ ان کا کہنا ہے کہ یونانی علوم جب مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو علمائے اسلام کی مخالفت کے سبب برگ و بار نہ لاسکے لیکن وہی علوم جب مسلمانوں سے اہل یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب میں ایک ولولہ انگیز سائنسی انقلاب آ گیا جس نے زندگی جینے کا انداز یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس قسم کی دعاوی اولاً تاریخ سے مکمل ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ ثانیاً یہ ایک ایسی ثقافت کے پیداوار ہیں جو عہد وسطیٰ کے سائنسی ترقیات کو صرف اس لیے اہل ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ترقیاں اقوام مغرب کی سرحدوں سے باہر ہو رہی تھیں۔ یہ سارا پروپیگنڈہ ایک ایسے عہد کی پیداوار ہے جب نوآبادیاتی تسلط کے سبب مسلمان جو اپنی ہلاکی جنگ لڑنے پر مجبور تھے ان غیر تاریخی پروپیگنڈہ کا سد باب نہ کر سکے۔ نتیجتاً پروپیگنڈہ کی دھند بیز ہوتی گئی اور آج عالم

ہے کہ ان متضبانہ فہوات کو مسلمہ تاریخی بیان کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پروپیگنڈہ کا بانی مہانی دراصل گولڈزیہر ہے جس نے سب سے پہلے اپنے ایک جرمن مقالہ "Stellung der alten islamischen Orthodoxie zu den antiken Wissenschaften" (Goldziher 1915) میں اس خیال کا اظہار کیا۔ اس کی بظاہر عالمانہ تصنیف 'Muhammedanische Studien (1888) جو بنیادی طور پر اسلام کا مطالعہ ایک finished phenomenon کی حیثیت سے کرتی ہے، متجددین اور مستشرقین دونوں کے لئے گمراہی کا سبب بنی رہی ہے۔

۶۸۔ Johannes Pedersen, *The Arabic Book* (trans. Geoffrey French) Princeton University Press, 1984,

pp. 116-17

۶۹۔ حوالہ مذکور، ص ۱۲۳

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۷۲۔ *The Cambridge History of Renaissance Philosophy*, Charles Schmitt and Quentin Skinner (ed.)

Cambridge University Press, 1988, pp. 11-12

۷۳۔ *The Arabic Book* حوالہ مذکور، ص ۶۲۔

۷۴۔ ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم کہ عہد عباسی کے ابتدائی دنوں میں بغداد میں کاغذ کی مختلف فیکٹریاں وجود میں آگئی تھیں اس کی حرت کہاں سے آئی۔ قرآن مجید میں رقی منشور اس بات کی طرف تو اشارہ کرتا ہے کہ کاغذ کی کوئی ابتدائی شکل عہد نبوی میں موجود تھی جس پر عرب شعراء اپنے تعلقات لڑکاتے اور لہجہ دین کے معاملات اور باہمی معاہدے ان پر تحریر کئے جاتے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہو یا یشاق مدینہ کی دستاویز یا رسول اللہ کے مختلف مکاتیب جو مختلف حکمرانوں اور سرداران قبائل کو لکھے گئے یا ان سب سے بڑھ کر خود قرآن مجید کا وہ نسخہ جو مصحف امام کی حیثیت سے مسجد نبوی میں استوانہ امام کے قریب رکھا ہوتا تھا اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی نسل لکھنے پڑھنے کے بنیادی آلات سے متصف تھی۔ البتہ کاغذ کی ایک ایسی عوامی صنعت جہاں اسٹیشنری کے سامانوں کی کثرت ہو خاص عہد عباسی کی پیداوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے کاغذ کی تکنالوجی آٹھویں صدی کے وسط میں اہل چین سے سیکھی یہاں تک کہ آٹھویں صدی کے آخر تک اس فن میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ بغداد کے پیپر مل تمام دنیا میں نفیس کاغذ کے لیے جانے جانے لگے حتیٰ کہ بعض لوگ اس کاغذ کو Bagdatixon کے نام سے پکارنے لگے۔

Jonathan Bloom, *Paper Before Print: The History and Impact of Paper in the Islamic World* Yale

University Press, 2001, pp.48-51.



گرین وچ کے ٹیلے پر واقع برطانوی رصد گاہ (قائم شدہ ۱۷۷۵ء) جس نے آنے والے دنوں میں وقت کا کنٹرول مسلمانوں سے چھین لیا۔

۷۵۔ ارسطو جس کے یہاں علم بنیادی طور پر اپنی تین ذیلی شاخوں فزکس، میٹافزکس اور میتھمیٹکس میں محدود ہے، ابتدائی صدیوں میں مسلم علماء کے لیے ایک دلفریب ماحذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ارسطو اس خیال کا حامل تھا کہ محض قوتِ حسن و ادراک علم کی ماہیت سے پردہ نہیں اٹھا سکتے لہذا کائنات کے بارے میں کوئی صحیح تصور قائم کرنے کے لیے احساس و ادراک کے علاوہ وجدان کو بھی اہمیت دینی ہوگی۔ قدیم یونانی ذہن اس بات کا قائل تھا کہ کائنات ازل سے ہے جسے ایک ایسی ہستی نے بنایا ہے جو ازل سے ایک قسم کے مراقبہ نفسی (Self Contemplation) میں محو ہے۔ ارسطو کا خدا گویا قرآن کے خدا سے یکسر مختلف تھا۔ کائنات کو خدا کی طرح قدیم ماننے سے شرک کا واضح تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مسلم علماء و مفکرین کے لیے کائنات کا یہ تصور قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ دانش یونانی کی ان مداخلتوں نے اگر ایک طرف فکری التباس کے امکانات کو جنم دیا تو دوسری طرف بالغ نظر مسلم ذہن کو بے لاگ تحلیل و تجزیہ کے لیے تحریک بھی ان ہی بیرونی فکری مداخلتوں سے ملی۔ مسلمانوں کے لیے خدا کا قرآنی تصور دین و ایمان کا مسئلہ تھا لہذا تمام فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود کائنات کا ازلی وابدی اور قدیم ہونا قابل قبول نہ ہو سکا۔ البتہ ارسطو کے الہیاتی نظام کے استرداد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی تصنیفات کی حتمی حیثیت خاصی مشکوک ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ آنے والے دنوں میں علوم کو محض تین ذیلی شاخوں میں محدود سمجھنے کے بجائے لامتناہی امکانات کا حامل سمجھا گیا اور مسلمان اہل فکر و فن نے علوم عقلیہ اور نقلیہ میں بے شمار ذیلی شاخوں کے تحت تحقیق و اکتشاف کی طرح ڈال دی۔ اگر ایک طرف کتاب الطہارۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب المعاملۃ، کتاب البیع اور کتاب الوراثۃ تخصیص کے میدان

قرار پائے تو دوسری طرف فطری سائنس میں کتاب المناظر، کتاب التحديد نهاية الاماكن، کتاب الهندسة اور کتاب النجوم جیسی تصانیف نے علوم کی بے پایاں وسعت کا اعلان کر دیا۔

۷۶۔ گوکہ کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد بڑی حد تک ارسطاطالیسی نظام فکر کے موئد اور مبلغ رہے لیکن قرآنی دائرہ فکر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ارسطو کی علمی عظمت ہر دور میں مسلسل تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنی رہی۔ اسے اگر حرف آخر کے طور پر قبول کر لیا جاتا تو اسلامی تہذیب محض یونانیوں کا ایک چربہ قرار پاتی۔ تہذیب کے ارتقاء کا عمل یکسر رک جاتا۔

۷۷۔ عہد مامون میں دانش یونانی کو اس قدر استناد حاصل ہو گیا تھا کہ اسے فکر اسلامی کا معاون و رفیق سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ شرع کی بصیرت اور توحید کی معرفت میں بھی حکمائے یونان کو قول فیصل کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مامون نے ایک دن خواب میں ارسطو کو ایک تخت پر متمکن دیکھا۔ مامون نے اس مرد بزرگ سے دریافت کیا کہ بھلائی فی الواقع ہے کیا؟ ارسطو نے کہا: وہ چیز جو عقل کے نزدیک بھلی ہو۔ مامون نے پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا جو شریعت کی نظر میں بھلی ہو۔ اور اس کے بعد؟ کہا جسے لوگ بھلا کہیں۔ پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ جس کے جواب میں ارسطو نے کہا اس کے بعد کوئی بعد نہیں ہے۔ اسی موقع پر مامون نے ارسطو سے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمائیے۔ کہا توحید کو تھامے رکھو۔ کہا جاتا ہے کہ شاید اسی خواب کا اثر تھا کہ مامون نے حکمائے یونان کی کتابوں کے تراجم کو اپنی زندگی کا مشن بنا ڈالا اور شاید اس لیے بھی کہ مامون کے ذہن میں دانش یونانی اور وحی ربانی میں کوئی نظری تعارض نہ تھا۔ بقول ابن الندیم:

فکان هذا (المنام) من اوكد الا سباب في اخراج الكتب فان المامون كان بينه وبين الملك الروم مراسلات وقد استظهر عليه المامون فكتب الى ملك الروم يسأله الاذن في انفاذ ما عنده من مختار من العلوم القديمة المخزونة المدخرة ببلاد الروم فاجاب الى ذلك بعد امتناع فاخرج المامون لذلك جماعة۔۔ فاخذوا همما وجدوا ما اختاروا فلم يحملوا اليه امرهم بنقله فنقل۔ (الفهرست، ص ۱۳۹)

۷۸۔ مراد ہیں ٹوبی ہف (Toby Huff) جن کی کتاب *The Rise of Early Modern Science* کے حوالے اس باب میں پہلے بھی آئے ہیں۔